دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی و اصلاحی

ماہنامہ

دارالعلوم

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر

مجید

جلد ۶ — شمارہ ۶

دار العلوم دیوبند کا دینی علمی ماہنامہ

دار العلوم

جمادی الثانی ۱۳۷۳ھ (مطابق) مارچ ۱۹۵۴ء

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا الحاج محمد طیب صاحب مدظلہ

مدیر

ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر

رسالہ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ پندرہ تاریخ کو شائع ہوگا

چندہ سالانہ

ہندوستان و پاکستان سے پانچ روپے سالانہ

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ، فی پرچہ ۸ آنے

طابع و ناشر: سید محمد ازہر شاہ قیصر مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی

مقام اشاعت دار العلوم دیوبند

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

(سیّد محمّد ازہر شاہ قیصر)

ہمارے معاونین!

(۱) جناب برکت اللہ صاحب نے رحیم یار خاں (بھاولپور) سے دُو خریداروں کا چندہ بھیجا ہے۔

(۲) مولٰینا محمّد یوسف صاحب خطیب بھاولنگر نے ۲ دُو خریدار عنایت فرمائے ہیں۔

(۳) مولوی قاری نذیر احمد صاحب دیوبندی نے بھاولنگر سے چار خریداروں کا چندہ بھیجا ہے، موصوف رسالہ کی توسیعِ اشاعت کے لئے اور بھی سعی کر رہے ہیں، اُمید ہے کہ ان کی محنت و توجہ سے خریداروں کی مزید تعداد بھی حاصل ہوگی۔

(۴) اخیر دسمبر میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی نے مدراس وحیدرآباد کا سفر فرمایا تھا، اس سفر میں ۶ احباب نے رسالہ "دارالعلوم" کی خریداری قبول فرمائی، اور دفتر رسالہ کو ان اصحاب کا چندہ وصول ہوا۔

(۵) جناب محمد سعدی خاں صاحب نے گوجرانوالہ (مغربی پاکستان) سے دُو خریدار عنایت فرمائے ہیں۔

(۶) برادرم مولٰینا عزیز الرحمٰن صاحب نے لائل پور سے دوؔ خریداروں کا چندہ بھیجا ہے۔

(۷) مولوی محمد عبد اللہ صاحب فاضل دیوبند نے ضلع منٹگمری سے دُو خریدار عنایت فرمائے ہیں۔

(۸) مولٰینا صفی اللہ صاحب نے برہمن باڑیہ (مشرقی پاکستان) سے دُو خریداروں کی پیشکش کی ہے۔

(۹) منیجر صاحب علی گڈھ دواخانہ قاضی پور خورد نے چار خریدار عنایت فرمائے ہیں، ادارہ موصوف کی اس کرم گستری کا سپاسگزار ہے۔

(۱۰) منشی فقیر محمد صاحب رائے کوٹی نے کمالیہ ضلع لائل پور سے تین خریداروں کا چندہ بھیجا ہے۔

(۱۱) مولٰینا محمد سعید احمد صاحب ڈونگہ بونگہ کی سعی سے جناب چودھری کبیر دین صاحب رئیس نے مبلغ ۵۰ روپیے رسالہ "دارالعلوم" کے لئے نقد عنایت فرمائے ہیں۔ اور وعدہ فرمایا ہے کہ سو روپے سالانہ کی رقم وہ بالالتزام عنایت فرمایا کریں گے۔ احقر مدیر چودھری صاحب کی عنایات کے دلی شکریہ کے ساتھ مولٰینا محمد سعید احمد صاحب کو بھی "الدال علی الخیر کفاعلہ" کے مصداق اپنے دلی شکریہ کا مستحق سمجھتا ہے۔

(۱۲) رسالہ دارالعلوم کے ایک مخلص قدردان جناب محمد طیب صاحب خانپوری نے کلور کوٹ ضلع میانوالی سے چار خریداروں کا چندہ بھیجا ہے احقر صاحب موصوف کے لئے دُعا گو ہے۔

(۱۳) مولٰینا عوض محمد صاحب بلوچستان فاضل دیوبند نے ۲ دُو خریداروں کا چندہ بھیجا ہے۔

(۱۴) ہمارے قدیم کرم فرما جناب منظور احمد خاں صاحب نے کراچی سے ایک اور جناب قاری شریف احمد صاحب صدیقی نے ۲ خریداروں کا چندہ بھیجا ہے۔

(۱۵) برادر عزیز مولوی ریاض احمد فیض آبادی، مدیر رسالہ کی طرف سے دلی تبریک و تحسین کے مستحق ہیں کہ آپ نے اپنی قیامگاہ بمبئی سے حال میں ۴۳ جدید خریدار فراہم کئے، برادر عزیز بڑی محنت اور دلسوزی کے ساتھ صوبہ بمبئی کے اس دور افتادہ شہر میں دینی تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

کوائفِ دار العلوم دیوبند

حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ کے سفر!

۲۶ر دسمبر ۵۳ء کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہ ایک سفر پر تشریف لے گئے جو ۶ر جنوری کو پورا ہوا۔ اس سفر میں ہردوئی، کان پور، الٰہ آباد، ناصری گنج (ضلع آرہ) مدرسہ اشرفیہ بھوجپور جدید ضلع آرہ، اور اٹاوہ جانا ہوا، سب مقامات پر تبلیغی اور اصلاحی جلسے تھے، جن میں حضرت موصوف نے تقریریں فرمائیں۔

۲۳ر جنوری کو حضرت موصوف گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کے ایک مختصر سفر پر تشریف لے گئے۔

اسٹوڈینس یونین مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے اسلامی نظام حیات پر اکابر علماء ہند سے یونی ورسٹی میں تقریریں کرانے کا ایک پروگرام مرتب کیا۔ حضرت مہتمم صاحب نے ۴ر فروری کو اس نظام کے ماتحت "اسلامی روحانیت زندگی سے الگ نہیں" کے عنوان پر مسلم یونی ورسٹی میں تقریر فرمائی۔

علی گڑھ سے واپسی پر حضرت موصوف نے فیروز آباد (ضلع آگرہ) کی ایک تقریب میں شرکت کی۔

جگر مرادآبادی، دار العلوم میں!

مشہور غزل گو شاعر استاذ جگر مرادآبادی ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں دیوبند آئے تھے، ۱۳ر جنوری کو آپ دار العلوم میں آئے، دفتر اہتمام میں حضرت مولانا سید مبارک علی صاحب نائب مہتمم، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب، مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کے ساتھ چائے نوشی کی، پھر طلبہ کے ایک اجتماع میں شریک ہوئے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ مرادآباد کے سفر پر تشریف لے گئے تھے اسی دن شام کو حضرت موصوف کی واپسی ہوئی۔ رات کو کھانا جگر صاحب نے حضرت مہتمم صاحب کے دولت کدہ پر تناول کیا۔ جگر صاحب نے دار العلوم کے متعلق عقیدت مندانہ جذبات اور سید محمد ازہر شاہ قیصر سے رسالہ "دار العلوم" کے متعلق اپنے اچھے خیالات کا اظہار کیا۔

امدادی عطیات!

(۱) محمد جلیل محمد فاروق صاحبان سوداگران چرم کلکتہ:- — ایک ہزار روپیہ

(۲) جناب حاجی احمد بن موسیٰ صاحب ڈیسائی رچمونڈ جنوبی افریقہ۔ (مہمان خانہ جدید کی تعمیر کے لئے):- — پانچسو روپیہ (۵۰۰)

(۳) یل، محمد اسمٰعیل صاحب بنگلور عما نے مولانا ارشاد احمد صاحب فیض آبادی کی تحریک پر مسجد مدرسہ کی صفوں کے لئے مرحمت فرمائے۔ — چار سو روپیہ (۴۰۰)

(۴) مولانا ریاض احمد صاحب فیض آبادی کی تحریک پر مسلمانانِ ہبلی ضلع ڈھارواڑ نے بمعرفت مولانا ارشاد احمد صاحب مرحمت فرمائے:- — چار سو گیارہ روپے (۴۱۱)

ہمارا پاکستانی پتہ:-

"دار العلوم" کے جملہ جدید و قدیم خریدار اپنا چندہ "مولانا محمد صاحب انوری مہتمم مدرسہ تعلیم الاسلام محلہ سنت پورہ لائل پور" کو روانہ کریں رسید اپنے نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ ہمیں بھیجدیں (ناظم)

قسط نمبر ۱

مقالات

فلسفۂ نعمت و مصیبت

(از حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ)

جرائم انسانی سے کائنات میں تعزیری حرکت اور جرم و سزا کا درمیانی رشتہ

اب رہا ذنوب و معاصی (یعنی جان بوجھکر خلاف ورزیٔ شریعت) اور اُن کی انتقامی سزاؤں کا درمیانی ربط یعنی جرم و سزا یا عمل اور جزاءِ عمل کا درمیانی رشتہ جس سے جرم کا اثر تو سزا دہندہ تک پہونچے کہ وہ مشتعل ہو اور سزا دہندہ کا اثر مجرم تک پہونچے کہ وہ سزا کی اذیت محسوس کرے سو ظاہر ہے کہ وہ مابہ الربط اور رشتۂ تاثیر و تاثر، احساس و ادراک کے سوا دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ سزا و تعزیر کوئی طبعی خاصیت نہیں کہ بلا ادراک و شعور اشیاء سے خود بخود اُبھرتی ہے۔ بلکہ شعوری چیز ہے جو بمنزلہ درسِ عبرت کے ہے کہ اُس کے ذریعہ کسی فرد یا قوم کو تعلیم و تربیت دینی مقصود ہوتی ہے، یا کسی نفس کو اُس کے درجہ اور مرتبہ یا مقام تک پہونچا کر یا بطور پاداشِ عمل راحت و کلفت دینی مقصود ہوتی ہے، اِس لئے ضروری ہے کہ مجرم بھی اپنے جرم کا شعور رکھتا ہو، ورنہ اُسے جرم پر تنبیہ و ملامت کیسے کیجا سکتی ہے؟ اور سزا دہندہ بھی اُس کے جرم کی بُرائی کا احساس رکھتا ہو ورنہ اُسے سزا پر اشتعال کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ اور پھر مجرم و منتقم دونوں کے اس احساس میں وحدۃ و اتصال بھی ہو کہ یہ رشتہ احساس مجرم و منتقم دونوں کے درمیان حسب مرتبہ و درجہ بلا تجزیہ و انقطاع پھیلا ہوا ہو، تا کہ ایک کے فعل کا اثر دوسرے کے آلات شعور و ادراک تک اس رشتۂ احساس کی وحدۃ و تسلسل کی بدولت پہونچ جائے۔ گویا جس طرح طبعی اور غیر اختیاری حرکات اور اُن کی غیر اختیاری خاصیات یعنی تکوینی تغیرات میں غیر اختیاری وجود کا متصل واحد سلسلہ تاثیر و تاثر کا ذریعہ بنتا تھا اسی طرح یہاں اختیاری اور شعوری افعال اور اُن کی شعوری سزا و تعزیرات میں کوئی شعوری ہی قسم کا رشتہ ذریعۂ تاثیر و تاثر ہونا چاہئے تھا جو جرائم اور تعزیرات میں ایک کا اثر دوسرے تک شعوری انداز میں پہونچا سکے۔ ظاہر ہے کہ وہ شعوری رشتہ احساس و ادراک کے سوا، دوسرا نہیں ہوسکتا جو ساری کائنات میں درجہ بدرجہ پھیلا ہوا ہے۔

فرق اتنا ہے کہ ان ذنوب کی پاداش میں جہانتک نفوس سے نفوس کو اور انسانوں سے انسانوں کو سزا دلانے کا تعلق ہے خواہ وہ اپنے ہی نفس سے اُبھرے ہوئے امراض و اذکار ہوں جن سے کوئی قوم گھلا کر ختم کردی جائے جیسے۔ بعض اقوام کو طاعون وغیرہ سے ہلاک کردیا گیا، یا دوسرے نفوس سے نفوس کو فنا کرادیا جائے جیسے قوموں کی جنگیں، قتل و غارت گری، اسارت و غلام سازی اور قید و بند وغیرہ وہاں تک جرم و سزا کا یہ درمیانی رشتہ یعنی احساس و شعور کچھ زیادہ دقیق اور پیچیدہ نہیں ہے جس میں گہری نظر و فکر کی ضرورت ہو کیوں کہ انسانی جرائم سے انسانوں کا پھڑک اُٹھنا، احساس و شعور ہی کی بدولت ہوتا ہے۔ قدرتاً مجرم کے جرائم کا علم و احساس ہونے پر طبائع اور نفوس میں نفرت و اشتعال پیدا ہوجانا اور اُس اشتعال دار و گیر اور مواخذہ و انتقام پر آمادہ ہوجانا، ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جرائم کا علم ہونے پر یہ قوائے ادراک و شعور ہی قوائے عمل کو حرکت میں لاتے ہیں اور سزا و انتقام کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ جرائم و تعزیرات میں جبکہ جرم و انتقام دونوں انسانوں ہی کے ہاتھ سے ہوں علم و ادراک ہی درمیانی رشتہ کا کام دیتا ہے جو مجرم کی طرف سے

اشتعال کا اثر منتقم میں اور منتقم کی طرف سے ایذادہی کا اثر مجرم میں پہونچاتا ہے۔ اگر فریقین بے حس اور جامد پتھر ہوں جن میں کوئی شعور و ادراک نہو تو فریقین کی یہ تاثیر و تاثر طبعی کہلائے گی جسے خاصیت کہیں گے شعوری نہیں ہوگی جسے تعزیر یا انتقام کہہ سکیں۔

البتہ جب جرائم پیشہ نفوس کو آفاقی کائنات سے سزا دلائی جائے اور بدکار انسانوں کو زمین کے زلزلوں، آسمان کی طوفانی بارشوں، فضاء کے مہلک طوفانوں، دریاؤں کے بے پناہ سیلابوں یا حیوانوں کے انسانوں پر تسلط وغیرہ سے ہلاک کرایا جائے۔ اور یہ سب کچھ بطور طبعی تغیرات کے نہو بلکہ بطور انتقام و تعزیر کے ہو تو پھر یہ شعوری رشتہ فطری ہو جاتا ہے، اور جتنا محسوس نہیں ہوتا کہ ان جمادات اور لایعقل اجزاء کائنات میں یہ شعوری جوش و انتقام کیسے پیدا ہو جاتا ہے؟ اور آخر یہ معمہ کیا ہے کہ ادھر تو ایک قوم میں فحش و زنا عادۃً ثانیہ بنکر شائع ہو اور ادھر طاعون کی وبا حرکت میں آجائے۔ ادھر فرعون اور اس کی قوم حدود سے گذرے اور ادھر دریائے قلزم میں اس کے خلاف جوش بپا ہو جائے۔ ادھر قوم نوح نخوت و انانیت کی انتہا پر پہونچ جائے اور ادھر زمین و آسمان کے دہانوں سے پھیل کر اسے پانی کا طوفان گھیرلے۔ ادھر قوم عاد آخری سرکشی دکھلائے اور ادھر آندھیوں کے طوفان اس پر مسلط ہو جائیں۔ ادھر قوم ثمود شرارتوں کی انتہا پر آئے اور ادھر فضاء آسمانی کی ایک خاص گرج اور چنگھاڑ ان کے کلیجے پھاڑدے۔ ادھر قارون کی اتراہٹ اور بغاوت حد کو پہنچے اور ادھر زمین منہ کھول کر اسے نگل لے۔ ادھر قوم لوط فواحش و منکرات اور ڈکیتی وغیرہ کے جرائم میں غرق ہو اور ادھر آسمان سے سنگباری شروع ہو جائے اور ان کی بستیوں کو فضاء میں اٹھا کر پٹخ دیا جائے۔ ادھر قوم ابراہیم سرکشی کی آخری منزل پر آئے اور ادھر کمزور مچھروں کا بادل ان پر موت کی بارش برسادے۔ ادھر اصحاب فیل بغاوت و سرگرانی پر اتریں اور ادھر طیراً ابابیل کا آسمانی لشکر سنگباری سے ان کے پرخچے اڑادے۔ ادھر قوم شعیب ناپ تول کی خیانت کی حد کرے اور ادھر ابر آسمانی سے اس پر آگ برسنے لگے

آیا جمادات و نباتات اور حیوانات کو انسانی جرائم کا خود بخود کوئی شعور و احساس ہوتا ہے جس سے یہ ان کے خلاف اپنی ارادی حرکت سے بھڑک اٹھتے ہیں یا کسی بیرونی مگر مخفی احساس و ادراک کا انھیں آلۂ کار بنایا جاتا ہے جس سے یہ عذاب بنکر انسانوں پر مسلط ہو جاتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اگر ان کے پیچھے کسی قسم کا احساس و شعور نہیں تب تو یہ طوفان وغیرہ محض طبعی تغیرات رہجاتے ہیں جن میں سے عذاب ہونے کی شان نکل جاتی ہے حالانکہ انہیں عذاب کہا گیا ہے، اور اگر کسی احساس و شعور سے یہ تغیرات اسی طرح نمایاں ہوتے ہیں جیسے مجرم قوم کے خلاف دوسرے انسانوں میں جرائم کے احساس سے غم و غصہ کا تغیر پیدا ہوتا ہے (اور اسی سے ان کا عذاب و تعزیر ہونا ثابت ہوسکتا ہے) تو اس کی کیفیت کیا ہے؟ ان جرائم و تعزیرات میں رشتہ ارتباط کس نوعیت کا ہے؟ اور آخر ان انسانی جرائم اور ان آفاقی مصائب میں وہ کیا علاقہ ہے کہ ایک زمین پر بیٹھے ہوئے انسان کا فعل آسمان یا دریاؤں، یا فضاء اور ہواؤں میں حرکت پیدا کر دیتا ہے؟

سو اسے وضاحت سے سمجھنے کے لئے اسپر غور کیجئے کہ مثلاً انسان کے اندر احساس و شعور کی جس قدر بھی قوتیں مخفی ہیں جیسے:۔ حواس خمسہ۔ لامسہ، باصرہ، سامعہ، ذائقہ اور شامہ وہ یقیناً جزوی ہیں۔ جو بقدر حصہ ہر ہر انسان کو حسب استعداد ملی ہیں، کل کی کل قوۃ ایک ایک فرد میں نہیں بھر دی گئی ہے کہ دوسرے کیلئے حصہ نہ رہا ہو۔ بلکہ جزوی طور پر ہر ایک کو منقسم ہوئی ہیں ؎

چہ خوش گفت دانا کہ دانش بسے است
ولیکن پراگندہ با ہر کسے است

اس لئے ضروری ہے کہ ان جزوی قوتوں کے کلی خزانے انسان سے باہر ہوں جن سے یہ قوائے احساس حسب استعداد ان میں آئیں اور احساس کا کام انجام دیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں سلسلہ علم و ادراک میں اصل وجود ان علمی خزانوں کا ہوگا نہ کہ ان فروعی اور جزوی قوتوں کا جو ہم تم میں ودیعت ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی اس صورت میں یہ بھی ضروری ہوگا کہ ہر حسی حالت و کیفیت کا ادراک و شعور اولاً

اُن ہی کلی قوائے ادراک و شعور کو جو احساس کے خزانے ہیں پھر اُن کے واسطہ اور طفیل سے ان جزوی اجزاء ادراک کو۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان میں اصل احساس اور حواس خمسہ کا خزانہ تو دماغ میں ہے جسے حس مشترک کہتے ہیں وہاں سے یہ قوائے احساس جزوی طور پر اعضاء بدن میں حسب مناسبت تقسیم ہوئے ہیں۔ وہ قوۃ باصرہ جس کا خزانہ ام الدماغ میں ہے اُس کا جزوی ظہور آنکھ میں ہوتا ہے، وہ قوۃ سامعہ جس کا مجموعی خزانہ ام الدماغ میں ہے اُس کا جزوی ظہور کان کے پردوں میں ہوتا ہے، وہ لامسہ جس کا کلی ذخیرہ ام الدماغ میں ہے اُس کی جزوی نمود ہاتھ پاؤں اور پوری جلد و بدن میں ہوتی ہے۔ اندریں صورت محسوسات میں سے جب بھی کسی دیکھنے کی چیز کا احساس عمل میں آئے گا تو وہ پہلے دماغ کو ہوگا جو منبع احساس ہے پھر اُس کے واسطہ اور طفیل میں آنکھ کو ہوگا۔ اسی طرح کسی شے کے بدن کو چھو جانے سے اگر کوئی لذت و کرب یا حرارت و برودت یا سختی اور نرمی اس چھوئے ہوئے عضو کو محسوس ہوگی تو بواسطہ دماغ کہ مخزن ادراک و شعور اصل میں وہی ہے نہ یہ عضو اُس کے واسطہ سے ہی یہ ظاہری اعضاء ان احساسات سے پر کیف ہوں گے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر دماغ فیل ہو جائے تو باوجود تمام اعضاء احساس کے صحیح سلامت ہونے کے محسوسات کا ادراک و شعور اعضاء سے ختم ہو جاتا ہے، اور اعضاء بیکار ہو جاتے ہیں۔ یہی حال تمام کیفیات کا سمجھ لینا چاہئے جو ان حسیات سے پیدا ہوتی ہیں کہ اُن کے ادراک و شعور کا مخزن بھی یہی دماغ ہے اور اُس کے طفیل میں اعضاء بدن ان کیفیات کو محسوس کرتے ہیں۔

یہ اس کی واضح دلیل ہے کہ ان قوائے احساس کے کلی خزانے یعنی ام الدماغ اور ان اعضاء احساس میں کوئی رشتہ اور رابطہ ہونا ضروری ہے جو اعضاء کو وہی احساس کرائے جو دماغ کو ہوتا ہو اور ظاہر ہے کہ وہ رشتہ سوائے اس ادراک و شعور کی پھیلی ہوئی طاقت کے دوسری کیا چیز ہو سکتی ہے؟ پس اگر کوئی جسمانی عضو کی کیفیت لذت والم کو محسوس کرتا ہے تو محض اس لئے کہ دماغ کی اس باطنی قوۃ احساس سے اُس کا رابطہ قائم ہے اور وہاں سے یہ قوۃ کسی مخفی راستہ سے اُس میں آ رہی ہے۔ ورنہ اگر یہ قوۃ رابطہ اُس عضو سے کنارہ کش ہو جائے تو اس عضو کا احساس و شعور بھی رخصت ہو جائے اور اس عضو کا کام ہی ختم ہو جائے۔ اگر اعضاء شہوۃ مثلاً اپنے طبعی افعال میں کوئی لذۃ محسوس کرتے ہیں تو نہ از خود بلکہ اس قوۃ احساس کے طفیل میں جو دماغ سے ان اعضاء تک کسی نہ کسی رنگ میں پہونچی ہوئی ہے۔ پس اس لذۃ کا ادراک پہلے دماغ کو ہوتا ہے پھر اعضائے متعلقہ کو۔ ورنہ اگر دماغ فیل ہو جائے یا ان اعضاء کا کنکشن دماغ سے صحیح نہ رہے، تو ان اعضاء کا شعور بھی رخصت ہو جائے۔ غرض ان باطنی قوائے ادراک کی بدولت ظاہری اعضاء کے احساس کی مجازی قوتیں بیدار ہوتی ہیں اور اپنے افعال کے دکھ درد یا حظ و لذۃ محسوس کرتی ہیں۔

ٹھیک اسی طرح عالم بشریت میں جو جزوی ادراک و شعور پھیلا ہوا ہے وہ بلاشبہ اُس احساس و شعور کا ایک اثر ہے جو احساس و شعور کے اصل خزانوں میں جوشزن ہے۔ اگر وہاں یہ احساسات نہ ہوتے تو انسانوں میں بھی نہ ہوتے۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ انسان ہی نہیں کائنات کی ہر وہ شے جس میں احساس کا کسی درجہ میں بھی وجود ہے اپنے احساس میں اُن مخزنوں کے تابع ہو، اور اُن مخزنوں سے ان جزوی حساس اشیاء تک ادراک و شعور کا کوئی مخفی رشتہ قائم ہو جو شعور کو بجلی کی طرح وہاں سے یہاں تک لاتا رہے۔

پس جس طرح انسانی بدن میں عمل کی قوتیں تو ہر ہر عضو کی الگ الگ ہیں لیکن وہ قوۃ جو سارے بدن اور بدن کے ہر ہر گوشے، بلکہ رُوئیں رُوئیں میں رُوح کی طرح دوڑی ہوئی ہے اور کسی ایک عضو کے ساتھ خاص نہیں وہ یہی قوۃ احساس و ادراک ہے جس کا خزانہ تو دل و دماغ اور حواس خمسہ کے کلی مخزن ہیں اور اس کے عمومی پھیلاؤ کا میدان ساری کائنات النفس ہے۔ اسی طرح اس پوری کائنات میں بھی عملی قوتیں تو ہر ہر جزو کی الگ الگ ہیں لیکن وہ قدر مشترک جو پوری کائنات میں برقی رَو کی طرح دوڑی ہوئی ہے وہ صرف احساس و ادراک کی طاقت ہے۔ جس کا خزانہ تو اُس کے مخصوص قوائے علم و ادراک ہیں لیکن اُس کا پھیلاؤ پوری کائنات میں ہے اور اسی لئے

کائنات کے ایک جزو کی خوبی و خرابی کے احساس کا اثر دوسرے جزو تک پہونچتا ہے جو اولاً ادراک شعور کے مخزنوں کو ہوتا ہے اور اُن کے طفیل میں تمام اجزاءِ کائنات کو اور پھر یہی احساس کائنات کی مخصوص عملی قوتوں کو اُبھارتا ہے اور عالم میں عجیب و غریب حرکات و صنائع نمایاں ہوتی ہیں۔

پس جس طرح ایک ہی سانحہ سے درجہ بدرجہ تمام قوائے بدن مختلف انواع کا اثر لیتے ہیں جو اُسی مابہ الاشتراک قوۃ احساس کے ذریعہ پہونچتا اور پھیلتا ہے۔ اور اس طرح لذت والم اور راحت و کلفت کا شعور اس علمی اشتراک، اور احساسی ارتباط کے ذریعہ قوائے احساس سے پوری کائناتِ بدن میں پھیل جاتا ہے جو درحقیقت انہی قوائے ادراک کا فیض ہوتا ہے۔ مثلاً اگر پیر آگ کی چنگاری پر پڑ جائے تو پیر پڑتے ہی سب سے پہلے دماغ کے قوائے علمیہ اس کی سوزش اور جلن کا احساس کریں گے۔ اُن کے واسطہ سے قوائے طبعیہ انقباض و ملال کا اثر لیں گے۔ اور طبیعت پگھلنے لگے گی۔ پھر اُن کے واسطے سے بدن کے اعضاء اضمحلال اور ضعف کا اثر لیکر لاغر اور رُو بہ ہزال ہوں گے۔ پس نفس انسانی کے کسی مصیبت سے دوچار ہونے پر دماغ کو ادراکی شعور ہوتا ہے تو وہ کوفت محسوس کرتا ہے قلب کو وجدانی شعور ہوتا ہے تو وہ غمگین اور خوفزدہ یا متفکر ہوتا ہے، طبیعت کو حسی شعور ہوتا ہے تو وہ گھل پگھل جاتی ہے، عضو ماؤف کو فعلی شعور ہوتا ہے تو وہ کمزور پڑ جاتا ہے اور بقیہ اعضاء کو اس حسی اشتراک سے انفعالی شعور ہوتا ہے تو وہ پژمردہ ہو جاتے اور کُمھلا جاتے ہیں، اور اس طرح ایک معمولی سے معمولی آفت سے یہ پوری کائناتِ بدن بفیض قوائے احساس مبتلائے مصیبت ہو جاتی ہے اور ہر ہر جزو بدن کو اپنی اپنی نوعیت اور مناسبتِ حال سے جو کوفت حصہ رسد پہونچتی ہے وہ درحقیقت اسی احساس و شعور کے پھیلاؤ سے پہنچتی ہے۔ اور گویا قلب و دماغ کا فیض ہوتا ہے جو عام قوا و اعضاءِ بدن تک آتا ہے جسے مزید وضوح کے لئے یوں سمجھئے کہ کسی حادثہ سے قلب میں علمی تأثر آ جانے کے بعد اس مبدا ادراک سے کچھ لطیف برقیاتی اور لاسلکی قسم کی وجودی شعاعیں دماغ تک جاتی ہیں جن سے اس کی فکری مشنری حرکت میں آتی ہے۔ پھر دماغ سے کچھ اور غیر مرئی شعاعیں جو پہلی شعاعوں سے لطافت میں کم ہوتی ہیں اُن قوائے عمل تک جاتی ہیں جن کے عمل کا تہیہ قلب میں ٹھنا ہوا تھا، اور جن سے یہ عملی قوتیں حرکت کرتی ہیں پھر ان قویٰ سے ذرا غلیظ و کثیف، اور مادیت سے قریب قسم کی شعاعیں اُن اعضاءِ بدن تک پہونچتی ہیں جن سے عملِ مطلوب سرزد ہوتا ہے جس سے یہ اعضاء و جوارح عملِ مطلوب کے لئے حرکت کرنے لگتے ہیں۔ پس یہ شعاعیں بھی وجود ہی کی ہوتی ہیں، اور وجود ہی کی ڈوری پر اس طرح دوڑتی ہیں جس طرح کسی انجن میں بھاپ کے مخزن سے اسٹیم کی لطیف شعاعیں پائپ کے راستہ اولاً انجن کے پسٹن پر اور اس کی حرکت سے پھر دوسری اسٹیمی شعاعیں کل پرزوں تک اور وہاں سے پھر آخر کار مشین کے پہیوں تک جا پہونچتی ہیں، اور اس طرح اسٹیم کے ان تار ہائے شعاع سے پوری مشین حرکت کرنے لگتی ہے۔ اگر ہم مسئلہ زیر بحث میں اسی حقیقت کو اصطلاحی الفاظ میں ادا کریں تو اس طرح کر سکتے ہیں کہ کسی آفت کا احساس کر کے قلب و دماغ کو اپنے تأثر کا الہام کرتا ہے یہ الہام قوائے احساس پر اُترتا ہے۔ پھر یہ قوائے احساس جو بدنی جہان کا ملاءِ اعلیٰ ہے قوائے طبعیہ پر الہام کرتے ہیں، جو اس جہان کا ملاءِ اسفل ہے پھر قوائے طبعیہ یا قوائے علمیہ اپنے اپنے اعضاء کو الہام کرتے ہیں کہ وہ حرکت میں آئیں اور اثرات جس سے اعضاء اس مصیبت کا احساس کرنے لگتے ہیں اور حسبِ الہام اُس کے دفعیہ کے لئے حرکت میں آجاتے ہیں۔ بہرحال اس تقریر سے یہ واضح ہو گیا کہ ایک عضو کی تکلیف یا مصیبت کا احساس دوسرے عضو کو ضرور ہوتا ہے اور بفیض قوائے ادراک و شعور ہوتا ہے نہ کہ از خود اور خود بخود۔

(باقی آئندہ)

فہرست کتب مفت طلب کریں!
علمی۔ مذہبی۔ ادبی کتابوں کا
مرکز
"مکتبہ فیض القرآن"
(دیوبند) یو۔پی

تیسری قسط:-

عہدِ نبوی میں قرآن مجید کی تدوین و ترتیب

(از جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی اُستاد شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی)

یہی ابن حزم قرآن مجید کے نسخوں کے متعلق رقم طراز ہیں:-

مات رسول الله صلی الله علیه وسلم والاسلام قد انتشر وظهر فی جمیع جزیرة العرب من منقطع البحر المعروف ببحر القلزم مارا الی سواحل الیمن کلها الی بحر فارس الی منقطعه مارا الی الفرات ثم علی ضفة الفرات الی منقطع الشام الی بحر القلزم و فی هذه الجزیرة من المدن و القری ما لا یعرف عدده الا الله کالیمن والبحرین وعمان و نجد وجبل طی وبلاد مضر وربیعة وقضاعة والطائف ومکة کلهم قد اسلم وبنوا المساجد لیس فیها مدینة ولا قریة ولا حلة لاعراب الا وقد قرأ فیها القرآن فی الصلوٰة وعلمه الصبیان والرجال والنساء وکتب ثم ولی ابوبکر سنتین وستة اشهر فغزا فارس والروم وفتح الیمامة وزادت قراءة الناس للقرآن ثم لم یبق بلد الا وفیه المصاحف ثم مات ابوبکر وولی عمر ففتحت بلاد الفرس طولاً و عرضاً وفتحت الشام کلها والجزیرة ومصر کلها ولم یبق بلد الا وبنیت فیه المساجد ونسخت فیه المصاحف و قرأ الائمة القرآن وعلمه الصبیان فی المکاتب شرقاً وغرباً وبقی کذلک عشرة اعوام واشهراً ——— وان لم یکن عند المسلمین اذ مات عمر مائة الف مصحف من مصر الی العراق الی الشام الی الیمن فما بین ذلک فلم یکن اقل ـ (کتاب الفصل ج ۲ ص ۷۷)

"یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو اسلام سارے جزیرہ عرب میں پھیل چکا تھا۔ بحرِ قلزم سے لے کر ساحلِ یمن تک اور بحرِ فارس سے فرات تک۔۔۔ اور اس جزیرہ میں بیشمار شہر اور گاؤں بسے ہوئے تھے مثلاً یمن، بحرین وغیرہ جہاں کے تمام باشندے اسلام لاچکے تھے جنہوں نے مسجدیں بنالی تھیں اور کوئی شہر، کوئی گاؤں، کوئی محلہ ایسا نہ تھا جہاں نمازوں میں قرآن نہ پڑھا جاتا، بچے، مرد اور عورتیں سب ہی اس کو حاصل کرتے تھے، اور وہ لکھا بھی جاتا تھا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ ڈھائی برس خلیفہ رہے۔ انہوں نے فارس و یمن پر حملے کئے۔ یمامہ فتح کیا، اور قرآن کی قرأۃ لوگوں میں زیادہ پھیلی۔ کوئی شہر ایسا نہ تھا، جہاں مسجدیں نہ بنی ہوں، اور قرآن مجید کے نسخے نہ لکھے گئے ہوں۔ مساجد کے امام قرآن پڑھتے تھے۔ لڑکے مکتبوں میں شرق سے غرب تک قرآن حاصل کرتے تھے، یہ حالت دس برس اور چند ماہ رہی، اور جس وقت حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا ہے اُس وقت مصر سے لے کر عراق و شام و یمن وغیرہ میں قرآن مجید کے کم سے کم ایک لاکھ نسخے رہے ہوں گے۔"

ملا عبد العلی بحر العلوم شرح مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:-

اجمع اهل الحق علی ان ترتیب آی کل سورة توقیفی بامر الله وبامر الرسول ——— والمحققون علی ان ترتیب السور من امر رسول (صلی الله علیه وسلم) (کتاب مذکور ج ۲)

"اہلِ حق کا اس بات پر اجماع ہے کہ ہر سورۃ کی آیتوں کی ترتیب خُدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہے اور محققین کا مذہب یہ ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہے۔"

۱۱۔ مولوی سید محمد صاحب مجتہد شیعی تنزیہ الفرقان میں مولوی سید مرتضیٰ علم الہدیٰ سے نقل کرتے ہیں:۔

ان القرآن کان علیٰ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجموعاً مولفاً علیٰ ما ھو علیہ الآن۔ (کتاب مذکور)

"یعنی قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسی طرح مرتب اور لکھا ہوا تھا جیسا کہ وہ آج ہے" (ملاحظہ ہو تاریخ القرآن مؤلفہ مفتی عبداللطیف صاحب ص۱۰۱ مطبوعہ رحمانیہ مونگیر)

۱۲۔ محمد بن الحسن حر عاملی شیعی لکھتے ہیں:۔

"ہر کسے کہ تتبع اخبار و تفحص تواریخ و آثار نمودہ بعلم یقینی میداند کہ قرآن درغایت اعلیٰ درجہ تواتر بود و آلاف صحابہ بحفظ نقل میکردند و آں در عہد رسول خدا مجموع و مؤلف بود۔"

"یعنی جس کسی نے بھی تاریخ و احادیث پر غور کیا ہے وہ یقیناً جانتا ہے کہ قرآن تواتر کے اعلیٰ درجہ پر ہے، ہزاروں صحابی اس کو یاد بھی کرتے تھے، اور دوسروں تک پہنچاتے بھی تھے اور یہ کہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مرتب طور پر لکھا ہوا تھا۔" (تاریخ القرآن ص۱۰۱)

غرض عہد نبوی میں قرآن مجید کی سورتوں اور آیات کی ترتیب اور اُس کی کتابی تدوین ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن تین روایتیں ایسی ملتی ہیں جن سے اس بارہ میں شبہ پیدا ہو سکتا ہے اس لئے آئندہ سطور میں، اس پر بحث کر کے انکی حقیقت ظاہر کی جائے گی۔

(۱) پہلی روایت ابن شہاب زہری سے مروی ہے جو صحیح بخاری میں تین جگہ آئی ہے، تفسیر سورۂ توبہ میں فضائل قرآن کے باب جمع القرآن میں۔ اور کتاب الاحکام کے باب یستحب للکاتب ان یکون امیناً عاقلاً میں۔ صحیح بخاری کے علاوہ جامع ترمذی تفسیر سورہ توبہ میں بھی یہ روایت ہے لیکن صحیح بخاری کی تینوں روایتیں اور ترمذی کی روایت سب کی سب ابن شہاب زہری عن عبید بن السباق سے مروی ہیں، بخاری کی سند میں زہری تک دو۲ واسطے ہیں پہلی میں عن ابی الیمان عن شعیب، دوسری میں عن موسیٰ بن اسمٰعیل عن ابراہیم بن سعد، تیسری میں عن محمد بن عبید اللہ

ع مولوی صاحب نے مضمون کی اس قسط میں بخاری شریف اور ترمذی کی چند روایتوں کو جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع و ترتیب قرآن کا کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تحریک پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اجلۂ صحابہ کی مدد سے پورا کیا اپنے اس نظریہ کی راہ میں حائل سمجھ کر کہ قرآن مجید کی ترتیب و کتابت کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا روایۃً اور درایۃً تنقید کی ہے ان روایات پر اسی قسم کے اعتراضات فرقۂ اہل قرآن کی طرف سے بھی کئے گئے ہیں اور وہ صرف اس وجہ سے کہ حدیث کے انکار کا بڑا سبب اس فرقہ کے نزدیک یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں احادیث کی کتابت اور جمع و ترتیب کا کام نہیں ہوا تھا۔ بعد میں ذخیرۂ حدیث کی جمع و ترتیب و فراہمی پر توجہ کی گئی اور اس فرقہ کے بقول "منافقین عجم" نے بہت سی من گھڑت اور موضوع و مکذوب روایات اس ذخیرہ میں ملا دیں۔ اب اگر حدیث ہی سے یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن شریف کی ترتیب بین الآیات یا بین السور۔ اس کی کتابت اور حفاظت کا کام بھی صحابہ ہی کے ہاتھوں مکمل ہوا تو فرقہ اہل قرآن کی وہ طاقت ہی ختم ہو جاتی ہے جس کے سہارے پر ان کے ذہن و قلم کی تلبیس و تحریف کا کاروبار گرم ہے۔ انہوں نے حدیث کے سارے ذخیرہ میں جو عیوب و نقائص پیدا کئے تھے وہی قرآن شریف میں بھی نکل آتے ہیں حالانکہ قرآن و حدیث دونوں کے متعلق یہ تسلیم کر لینے کے باوجود کہ ان کی ترتیب و تدوین میں صحابہ کرام کی شرکت رہی ہے۔ اہل قرآن کے اس بیان میں کہ احادیث کا پایۂ اعتبار صحیح نہیں یا ان کی یہ کوشش کہ قرآن کی ترتیب و تدوین کو صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تک محدود کر دیا جائے کوئی حقیقت پیدا نہیں ہوتی۔ احادیث کے متعلق ایسا سمجھنے اور قرآن کے لئے ایسا سمجھنے کی کوشش کرنے سے اُمت کو فائدہ کوئی نہیں، نقصانات بے شمار ہیں۔

ہمارے مضمون نگار نے بخاری و ترمذی کی ان احادیث پر جو تنقید کی ہے اگرچہ اس کے معنی و مفہوم اس سے الگ ہے لیکن ان کی اس تحقیق کا فائدہ غیر شعوری طور پر اہل قرآن کو پہونچ سکتا ہے، اور یہ تنقید مختلف وجوہ سے بجا، خود بھی محل نظر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مولوی صاحب کے اس سارے مضمون کو پہلے شائع کر دیں تاکہ تصویر کا ایک رخ پڑھنے والوں کے سامنے آجائے۔ اس کے بعد ہم موصوف کی تحقیقات، اور بخاری شریف و ترمذی کی جن روایات پر انہوں نے تنقید کی ہے، ان پر گفتگو کریں گے۔ (سید محمد ازہر شاہ قیصر)

ابی ثابت عن ابراہیم بن سعد۔ ترمذی کی روایت میں زہری تک تین واسطے ہیں عن محمد ابن بشار عن عبد الرحمٰن بن مهدی عن ابراهیم بن سعد۔ غرض تمام طرق کا مدار زہری پر ہے، جو عبید بن السباق سے اس کو روایت کرتے ہیں۔ محدثین نے کسی روایت کو جانچنے کے دو قاعدے مقرر کئے ہیں، پہلا باعتبار سند، دوسرا باعتبار درایت وعقل، اس لئے ان روایتوں کا متن نقل کرکے انہی کے قواعد کی روشنی میں ان پر بحث کی جائے گی۔ روایت یہ ہے:۔

عن زید ابن ثابت قال بعث الی ابوبکر لمقتل اهل الیمامة وعنده عمر فقال ابوبکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة بقراء القرآن وانی اخشی ان یستحر القتل بقراء القرآن فی المواطن کلها فیذهب قرآن کثیر وانی اری ان تأمر بجمع القرآن فقلت کیف افعل شیئاً لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال عمر هو والله خیر فلم یزل عمر یراجعنی فی ذلک حتی شرح الله صدری للذی شرح له صدر عمر ورأیت فی ذلک الذی رأی عمر قال زید قال ابوبکر وانک رجل شاب عاقل لا نتهمک قد کنت تکتب الوحی لرسول الله صلی الله علیه وسلم فتتبع القرآن فاجمعه قال زید فوالله لو کلفنی نقل جبل من الجبال ما کان باثقل علی مما کلفنی من جمع القرآن قلت کیف تفعلان شیئاً لم یفعله رسول الله قال ابوبکر هو والله خیر فلم یزل یحث مراجعتی حتی شرح الله صدری للذی شرح الله صدر ابی بکر وعمر ورأیت فی ذلک الذی رأیا فتتبعت القرآن اجمعه من العسب والرقاع واللخاف وصدور الرجال فوجدت آخر سورة التوبة "لقد جاءکم رسول من انفسکم" الخ مع خزیمة او ابی خزیمة فالحقتها فی سورتها وکانت الصحف عند ابی بکر حیاته حتی توفاه الله ثم عند حفصة بنت عمر (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۹ و ص ۱۵۰)

"یعنی زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ یمامہ قتل کے واقعہ کے بعد مجھ کو حضرت ابوبکرؓ نے بلا بھیجا، حضرت عمرؓ بھی اُن کے پاس تھے حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ عمر نے آکر مجھ سے کہا کہ یمامہ میں قرآن کے قاری بہت قتل ہوگئے ہیں، اگر لڑائیوں میں قرآن کے قاری اسی طرح زیادہ قتل ہوتے رہے تو بہت سا قرآن ضائع ہوجائے گا اس لئے میری رائے ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا حکم دیں، حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمر سے کہا میں کیسے وہ کام کروں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہے عمرؓ نے جواب دیا، خدا کی قسم یہ اچھی بات ہے، عمرؓ مجھ سے اس بارے میں برابر گفتگو کرتے رہے، یہاں تک کہ خدا نے میرا سینہ بھی اس رائے کے لئے کھول دیا جس کیلئے عمر کا سینہ کھولا تھا، اور عمر کی طرح میری سمجھ میں بھی یہ بات آگئی۔ زید کہتے ہیں کہ ابوبکر نے مجھ سے کہا کہ تم جوان عقلمند ہو اور تمہارا دامن بھی اتہام سے پاک ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی بھی تھے اس لئے قرآن تلاش کرکے جمع کرو۔ زید کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اگر کسی پہاڑ کے ہٹانے پر بھی وہ مامور کرتے تو مجھ پر اتنا گراں نہ گزرتا جتنا قرآن کا جمع کرنا میرے لئے گراں تھا، میں نے کہا آپ دونوں ایسا کام کس طرح کرنا چاہتے ہیں جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم یہ اچھی بات ہے اور برابر مجھ سے اس بارے میں گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ بھی اس رائے کے لئے کھول دیا، جس کیلئے ابوبکر وعمر کا سینہ کھولا تھا، اور میں نے بھی وہی سمجھ لیا جو انہوں نے سمجھا تھا۔ چنانچہ میں نے کھجور کی چھالوں، چمڑے کے ٹکڑوں، پتھروں، نیز اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کی تلاش شروع کردی، تو سورہ توبہ کی آخری آیتیں خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملیں۔"

صحیح بخاری کی اس روایت میں جو تین جدا جدا مقامات پر آئی ہے، الفاظ کے اندر اختلاف پایا جاتا ہے، جس کو اصطلاح محدثین میں اضطراب کہتے ہیں، اضطراب کی وجہ سے حدیث کی قوت کم ہوجاتی ہے۔ وہ اختلاف یہ ہے:۔

بخاری کی روایت ابراہیم سے	بخاری کی روایت شعیب سے	ترمذی کی روایت
(۱) قد استحر یوم الیمامة بقراء القرآن۔	(۱) قد استحر یوم الیمامة بالناس۔	(۱) قد استحر بقراء القرآن یوم الیمامة
(۲) من العسب والرقاع واللخاف وصدور الرجال۔	(۲) من الرقاع والاکتاف والعسب وصدور الرجال۔	(۲) من الرقاع والعسب واللخاف وصدور الرجال۔

ترمذی کی روایت	بخاری کی روایت شعیب سے	بخاری کی روایت ابراہیم سے
(۳) مع خزیمة بن ثابت -	(۳) حتی وجدت من سورة التوبة آیتین مع خزیمة الانصاری	(۳) فوجدت اٰخر سورة التوبة مع خزیمة او ابی خزیمة -
(۴) ترمذی میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں -	(۴) شعیب کی روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں -	(۴) فالحقتها فی سورتها

یہ اضطراب متن کا ہے، سند میں دیکھا جائے تو حسب ذیل امور قابلِ بحث ہیں :-

(۱) زہری کے متعلق میزان الاعتدال، جلد سوم ص۱۲۶ میں ہے :-

کان یدلس فی النادر - "کبھی کبھی وہ تدلیس کرجاتے تھے"

یعنی کسی معاصر سے بغیر سُنے ہوئے اس طور پر روایت کرنا کہ سُنا ہوا معلوم ہو یا سُنی ہوئی بات اس طرح بیان کرنا کہ استاد کی شناخت نہ ہو سکے -

اور تہذیب التہذیب جلد نہم ص۴۴۷ پر ہے :-

وقد رما ائتین من حدیثہ عن غیر الثقات واما ما اختلفوا فیہ فلا یکون خمسین حدیثاً، والاختلاف عندنا ما تفرد بہ قوم فی شیٔ -

"یعنی دو سَو حدیثیں زہری کی غیر ثقہ لوگوں سے مروی ہیں، اور وہ حدیثیں جن میں محدثین نے اختلاف کیا ہے پُوری پچاس نہ ہونگی، اور اختلاف کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں کہ جسکو کسی جماعت نے منفرد ہو کر بیان کیا ہو"

(۲) زہری کی عادت ادراج، یعنی حدیث میں اپنی طرف سے الفاظ بڑھا دینے کی بھی تھی - چنانچہ آغاز وحی والی حدیث میں "تحنث" کے بعد "وھو التعبد" ان کا ادراج ہے - (ملاحظہ ہو فتح الباری ج اول ص۱۲ اور تدریب الراوی ص۹۹) توجیہ النظر ص۱۴۲ پر ہے :-

والادراج بجمیع اقسامہا محرّم وقال السمعانی من تعمد الادراج فھو ساقط العدالة وقد استثنی بعضھم من ذلك ما ادرج لتفسیر غریب وقد فعله الزہری -

"یعنی ادراج کی تمام قسمیں منع ہیں سمعانی کہتے ہیں جو شخص قصداً ادراج کرے، اسکی عدالت ساقط ہو جاتی ہے - لیکن بعض لوگوں نے اس ادراج کو مستثنیٰ کیا ہو جو کسی نادر لفظ کی تشریح کے لئے ہو، اور ایسا ادراج زہری نے کیا ہے" (کتب مذکورہ ص۹۹ و ۱۴۲)

(۳) زہری اس روایت میں منفرد ہیں، کیونکہ اور کسی نے اس واقعہ کو روایت نہیں کیا ہے، تفرد بھی ضعف کا موجب ہے اور زہری کی اس روایت میں ادراج اور تدلیس اور تفرد یہ سب باتیں موجود ہیں، جس سے یہ روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہے -

(۴) دوسرے راوی ابراہیم بن سعد کی بابت میزان الاعتدال، جلد اول ص۱۷ پر ہے :-

ذکر عند یحییٰ ابن سعید عقیل وابراھیم فجعل کانہ یضعفھما "یعنی یحییٰ بن سعید کے سامنے عقیل اور ابراہیم کا ذکر ہوا، تو انہوں نے ان دونوں کو ضعیف بتلایا"

(۵) عبید بن السباق جو اس واقعہ کو زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں، اُن کے نہ سنہ ولادت کا پتہ ہے نہ سنہ وفات کا - تہذیب التہذیب جو اسماء الرجال کی سب سے بڑی کتاب ہے، اس میں ان کا ذکر صرف چند سطروں میں ہے اور وہ بھی اس طور پر کہ جن لوگوں سے انہوں نے روایت کی، اور جن لوگوں نے اُن سے روایت کی، اُن کے نام لکھ دیئے ہیں، خود اُن کی ذات کے متعلق صرف دو کلمے ہیں :-

الثقفی المدنی - "یعنی قبیلۂ ثقیف کے اور مدینہ کے رہنے والے ہیں"

(۶) سورۂ توبہ کی آخری آیتوں کا خزیمہ یا ابو خزیمہ سے ملنے کا بیان بھی شک کے ساتھ ہے، کیوں کہ یہ دونوں الگ الگ ہیں، اور شک موجب ضعف ہے، یہ تو اس روایت کی روایتی حیثیت ہے درایتی حیثیت یہ ہے کہ :-

۱- تفرد اور احاد ہونے کی وجہ سے تواتر کے مقابلہ میں ناقابلِ قبول ہے، کیوں کہ تواتر سے یہ ثابت ہے کہ عہد نبویؐ ہی سے پُورا قرآن مرتب ہو کر بذریعہ تواتر نقل ہوتا چلا آرہا ہے، اس لئے اس تواتر کے مقابلہ میں یہ روایت اگر قوی بھی ہوتی تو بھی معتبر نہیں ہوسکتی تھی، نہ کہ اس میں مذکورہ بالا کمزوریاں بھی موجود ہیں، اس حالت میں مقابلہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا -

۲- یہ روایت خود زہری کی بخاری کی اس روایت کے خلاف ہے، کہ زید بن ثابتؓ نے عہد نبوی میں قرآن جمع کیا تھا۔

۳- اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی متفرق آیتیں پتھر کے ٹکڑوں، پتوں اور کھجور کی چھال پر لکھی ہوئی تھیں، جن کی حفاظت بحیثیت مجموعی غیر ممکن ہے، اور عقل اس کو ہرگز باور نہیں کر سکتی، کہ قرآن جیسی اہم چیز اس طرح پراگندہ پڑی رہی ہو، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا کچھ خیال نہ فرمایا ہو، یہ چیز بلغ ما انزل الیک کے بھی خلاف ہے، کیوں کہ تبلیغ کامل کی صورت صرف یہی ہے کہ کلام مجید کو مرتب اور محفوظ صورت میں لوگوں تک پہنچایا جائے، تا کہ کسی خلل کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ پتوں وغیرہ پر لکھے ہونے کی حالت میں ترتیب سور کا کیا ذکر، ترتیب آیات بھی قایم نہیں رہ سکتی تھی، حالانکہ عہد نبوی میں آیات کی ترتیب روز روشن کی طرح ثابت ہو چکی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ عہد نبوی میں قرآن کی تعلیم کا مکمل انتظام ہونا ثابت ہے، اور پراگندہ حالت میں جبکہ پتھر کے ٹکڑوں اور پتوں پر وہ لکھا ہوا تھا، اس کی تعلیم کس طرح ممکن ہوتی۔

۴- حضرت ابوبکرؓ ربیع الاول ۱۱ھ میں خلیفہ ہوئے، آپ کی مدت خلافت دو برس تین ماہ گیارہ یوم ہے، جنگ یمامہ ۱۱ھ کے آخر میں ہوئی ہے، اگر زید بن ثابتؓ نے اس جنگ کے بعد قرآن کو جمع کیا، اور جیسا کہ اس روایت سے ثابت ہے حضرت ابوبکرؓ ہی کے زمانہ میں اس کو مکمل بھی کر لیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تقریباً ڈیڑھ سال میں انھوں نے ہی یہ عظیم الشان کام پورا کر لیا۔ جو بالکل خلافِ عقل ہے کہ تنہا ایک شخص اتنے بڑے کام کو جو کوہ کندن سے بھی زیادہ سخت ہے اتنی قلیل مدت میں مکمل کر لے، اس کام کی دشواری کا بیان خود روایت میں بھی موجود ہے۔

۵- عقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسے اہم اور مشکل کام کو تنہا ایک شخص کی سپردگی میں دیا ہوگا جبکہ قرآن سے شغف رکھنے والے اور بہت سے صحابہ بلکہ ان سے بہتر زندہ موجود تھے مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو الدرداء وغیرہما جن کے اسماء اوپر تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں، بلکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام حفاظ اور کُتّابِ صحابہ کی پوری جماعت کے سپرد کیا جاتا، جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے اس سے کہیں کم اہم یعنی نقلِ مصاحف کا کام ایک جماعت کے سپرد کیا تھا،

۶- اس روایت کا یہ بیان بھی کہ جنگ یمامہ میں بکثرت قاری شہید ہوئے، واقعہ کے خلاف ہے، یوں تو اس زمانہ کا ہر مسلمان قاری و حافظ تھا، اس لئے جتنے بھی مسلمان شہید ہوئے سب قاری و حافظ رہے ہوں گے، لیکن یہ لوگ اس پایہ کے نہ تھے کہ ان کی شہادت سے قرآن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو سکتا، ایسے قراء و حفاظ جن کا خاص مشغلہ قرآن تھا اور جن کی شہادت سے قرآن کے ضائع جانے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، اُن میں کم تھے، مشہور قراء میں سے صرف سالمؓ مولیٰ حذیفہ اس جنگ میں شہید ہوئے۔ اس لئے قرآن مجید کی جمع و ترتیب کا سبب قراء کی شہادت کو قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔

۷- قرآن مجید کی اہمیت اس کی متقاضی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیتے، جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے لیکن اگر بفرض محال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو نہیں کیا تھا، تو آپ کی وفات کے بعد صحابہ اور خلفاء کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ بلا لحاظ اس کے کہ کسی جنگ میں قراء شہید ہوئے ہوں یا نہ شہید ہوئے ہوں، قرآن کی ترتیب و جمع کا فرض انجام دیتے، کیوں کہ قراء کی شہادت اگر نہ بھی ہوتی، تو بھی موت سے کس کو مفر ہے، ایسی حالت میں صرف حفاظِ قرآن کی موت ہی کے اندیشہ سے یہ فرض تھا کہ صحابہؓ اس کو جمع و مرتب کر کے اس کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھیجدیتے، جس طرح حفاظِ قرآن کو خلفاء نے جابجا بھیجا تھا۔

۸- جمع و ترتیب قرآن کے بارے میں اگر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور زید بن ثابتؓ کی یہ روداد صحیح مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید کی جمع و ترتیب سے بے خبر تھے، حالانکہ خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ متعدد صحابہؓ نے عہد نبویؐ میں قرآن جمع کر لیا تھا، اور عقل اس کو باور نہیں کر سکتی، کہ قرآن جمع ہو گیا ہوتا، اور یہ حضرات بے خبر رہتے۔

۹- سورہ براۃ کی آخری آیتوں کا صرف خزیمہ یا ابو خزیمہ (بقیہ ص ۔۔)

بارھویں قسط ۱۲ :-

تذکرہ اُدبائے دار العُلوم دیوبند

(پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی اسلامیہ کالج لائل پور)

مولانا نانوتویؒ اور غالب کے خطوط میں مقفیٰ عبارتیں :-

مجھے یاد نہیں آتا کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے غالب کے خطوط کی جو خصوصیتیں بیان کی ہیں ان میں یہ خصوصیت بھی لکھی ہے کہ غالب نے اپنے خطوط میں بہت سے مواقع پر مقفیٰ اور مسجع عبارتیں جابجا لکھی ہیں۔ حالانکہ غالب کی خطنویسی میں یہ بھی ایک ممتاز اور درخشاں صفت موجود ہے۔ اس وصف کی نمائش کے لئے صرف ایک خط کی جو غالب نے مفتی سید محمد عباس کو لکھا ہے چند سطریں لکھتا ہوں :۔

"قبلہ حضرت کا نوازشنامہ آیا میں نے اس کو حرز بازو بنایا آپ کی تحسین میرے واسطے سرمایۂ عزّ و افتخار ہے، فقیر اُمیدوار ہے کہ یہ دفتر بے معنی سراسر دیکھا جائے نہ چیں نظر دھرا ہے بلکہ اکثر دیکھا جائے۔ میں نے جو نسخہ بھیجا ہے گویا کسوٹی پر سونا چڑھایا ہے۔ نہ ہٹ دھرم ہوں نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے، دیباچہ و خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے" (اُردوئے معلی صـ۱۲۹)

حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اُردو خطوط میں کہیں کہیں اور فارسی خطوط میں اکثر اس قسم کی مقفیٰ اور مسجع عبارتیں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ غالب بتکلف قافیہ بندی کرتے ہیں، اور حضرت قاسم العلوم کی قافیہ آرائی بے ساختہ قلم سے ٹپکتی چلی جاتی ہے۔ حضرت قاسم العلوم نے پیر جی محمد عارف صاحب کے ذریعہ سے بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ سرسید کو اپنے ایک طویل مکتوب میں حسب ذیل سطور تحریر فرمائی ہیں۔ لکھتے ہیں :-

"جی میں یہ آتا ہے کہ قلم ہاتھ سے ڈال دیجئے مگر کیا کروں آپ کا تقاضہ جُدا جان کو کھائے جاتا ہے، مولٰنا محمد یعقوب صاحب کا ارشاد جُدا ہی ڈراتا ہے، گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ جب بے کہے نہ بنی تو قلم کو روک روک کے کچھ مختصر مختصر عرض کر دینا مناسب جانا۔ ورنہ جی میں یہ ٹھانا کہ ہرچہ باداباد پھر قلم نہ اُٹھانا"

(تصفیۃ العقائد صـ۵)

مذکورہ سطور میں 'کھائے جاتا ہے' 'جدا ہی ڈراتا ہے' 'مناسب جانا' 'جی میں یہ ٹھانا' 'پھر قلم نہ اُٹھانا' مسجع اور مقفیٰ ٹکڑے ہیں۔ مگر مولٰنا نے غالب کی طرح ان قوافی کا التزام نہیں کیا ہے۔

مکتوبات قاسمی کے ضمن میں حضرت قاسم العلومؒ اور سرسید کا ذکر آگیا ہے اس لئے اُنیسویں صدی کی ان دونوں ہستیوں کا اُردو ادب اور اُردو خطنویسی کے ضمن میں تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے بعد انگریز کے تمدن اور آزادیٔ مذہب نے ہندوستان کے لوگوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کیا، سرسید جو کہ اپنی ابتدائی زندگی میں مذہب میں پکّے اور ٹھوس آدمی تھے، مغربیت کے رنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ملک میں ان کے خلاف ایک طوفان برپا ہوگیا، اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی ترقی اور اشاعت تعلیم جدید میں محدود رہ کر مذہب میں کوئی ایسا قدم نہ اُٹھاتے کہ ان کی ذات سے مسلمانانِ ہند کو اختلاف کی نوبت آتی۔ کتنے ایک ہمدردانِ مذہب نے سرسید کو اس سلسلہ میں راہِ مستقیم دکھانے کی کوشش کی لیکن بے سود رہی، شروع شروع میں محسن الملک وغیرہ ایسے ان کے مخلص بھی سرسید کے مخالف تھے۔ شبلی کو بھی اس قسم کا اختلاف رہا۔ ان ہی مذہبی

خیالات کی بے راہ روی کا نتیجہ تھا کہ سرسید کی وفات کے بعد اُن کے مذہبی خیالات کی ترجمان کتابوں کو مسلم یونیورسٹی کے نصاب سے خارج کردیا گیا تھا۔ بہرحال یہاں محض تعارف مراسلات کیلئے یہ چند سطریں میں نے حوالۂ قلم کی ہیں نہ کہ گذشتہ اختلافات کی ہنگامہ آرائی کے لئے دروازہ کھولا ہے۔ اسی اصلاح خیال کیلئے حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے سرسید کے مکتوب کے جواب میں جو بوساطت پیرجی محمد عارف صاحب مرحوم آئے گئے۔ خط تحریر فرمایا ہے۔ پہلے میں سرسید کا خط نقل کرتا ہوں اور پھر قاسم العلوم کا۔ ان خطوط کے ضمن میں قاری کو دونوں ہستیوں کی انشاء پردازی اور اخلاق و خیالات کا جائزہ لینے کا سامان فراہم ہوسکے گا۔

مکتوب سرسید بنام حضرت نانوتویؒ بوساطت پیرجی محمد عارف صاحبؒ

"جناب پیرجی صاحب
مخدوم مکرم سلامت!
بعد سلام مسنون کے

عرض ہے کہ بزرگانِ سہارنپور نے جو نوازش و دلسوزی میرے حال زار پر کی جس کا ذکر آپ نے مجھ پر فرمایا میں دل سے اُن کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ہے میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔ مگر اس وقت مرزا غالب کا ایک شعر مجھے یاد آیا۔ وہو ہٰذا ؎

حضرت ناصح جو آویں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا

جنابِ من! میری تمام تحریریں جن کے سبب میں کافر و مرتد ٹھیرا ہوں اور وحدانیت و رسالت کی تصدیق کے ساتھ کفر جمع ہوا ہے جو میرے نزدیک محالات سے ہے چند اصول پر مبنی ہیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان اصولوں کو بزرگانِ سہارنپور کی خدمت میں بھیجدیں اگر ان میں کچھ غلطی ہے تو بلاشبہ نصیحت ناصح کارگر ہوگی ورنہ ایسا نہ ہو کہ ناصح ہی مجھسے خفا ہو جائیں۔ اور وہ اصول یہ ہیں :-

---

پس اگر بزرگانِ سہارنپور ان اصول کی غلطی سے مجھے مطلع فرمادیں گے میں دل و جان سے شکر ادا کروں گا۔ والسلام

(سید احمد)

مکتوب مولٰنا نانوتویؒ بنام سرسید بوساطت پیرجی صاحبؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
مجموعۂ عنایات

پیرجی محمد عارف صاحب السلام علیکم و علیٰ من لدیکم!

آج بندہ درگاہ دلّی سے میرٹھ واپس آیا تو مولوی محمد ہاشم صاحب نے مولٰنا محمد یعقوب صاحب کا عنایت نامہ جو آیا رکھا تھا عنایت فرمایا۔ کھولا تو آپ کا خط اور جناب سید احمد خاں صاحب کی ایک بڑی تحریر اندر سے نکلی۔ شاید یہ قصہ اُس گفتگو کا نتیجہ ہے جو آخر ماہ شوال میں بمقام انبیہٹہ مابین احقر و جناب ہوئی تھی۔ سید صاحب کی تحریر سے کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ آپ نے میرے آنے کا کچھ تذکرہ اُن سے کیا ہوگا مگر مجھکو یاد نہیں آتا کہ آپ نے کس بات سے سمجھا ہوگا۔ اُس وقت کی عرض معروض کا ماحصل فقط اتنا ہی تھا کہ سید صاحب کی ہاں میں ہاں ملانا ہم سے جبھی متصور ہے کہ سید صاحب اپنے اُن اقوال مشہورہ سے رجوع کریں جو اُن کی نسبت ہر کوئی گاتا پھرتا ہے، اور سید صاحب اُن پر اصرار کئے چلتے ہیں، اور رجوع نہیں فرماتے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ گذارش میری طرف سے آپ کی اس استدعا کے جواب میں تھی جو آپ نے دربارۂ شمولِ حالِ جناب سید صاحب اس ناکام سے کی تھی۔ بہرحال آنے جانے کا کچھ مذکور نہ تھا۔

(۲) آپ ہی فرمائیں کہ ہم سے گرفتاروں کو اتنی رہائی کہاں کہ بنارس، غازیپور اڑ جائیں اور ہم سے بیچاروں کو اتنی رسائی کہاں کہ سید صاحب کے درِ دولت تک نوبت پہنچائیں، اپنا مبلغ پرواز میرٹھ حد نہایت دلّی ہے تسپر نقارخانہ

میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ بات آسکتی ہے کہ صدر الصدور اعظم ایک غریب سے مزدور کے طور پر ہو جائیں۔ اجی حضرت امیروں کے ذہن و فہم و عقل و ادراک کے ہزاروں گواہ ہوتے ہیں۔ غریبوں کے فہم و فراست کا کہیں ایک بھی نہ سُنا۔ اس صورت میں کیوں کر کہہ دیجئے کہ سید صاحب ایک غریب سے شیخ زادہ کی مان جائیں ؎

کب وہ سنتے ہیں کہانی میری + اور وہ بھی زبانی میری

شکستہ حالوں کی باتوں پر موافق مصرعہ غالب (بلکہ شعر غالب) ؎

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک

میں کہوں گا حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

ایسے عالی مراتب دانشمند ہرگز توجہ نہیں فرمایا کرتے۔ با ایں ہمہ ایسی چھیڑ چھاڑوں میں کبھی نہیں دیکھا کہ کسی ادنیٰ نے بھی کسی اعلیٰ کی مانی ہو۔ اس صورت میں ایسی برعکسی کی کیا امید باندھیئے۔

پیر جی صاحب! یگنام کبھی کسی سے نہیں اُلجھتا اور اُلجھے بھی تو کیونکر اُلجھے۔ نہ کونسی خوبی ہے جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار ہو۔ ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عمدہ مشاغل چھوڑ کر اس نفسا نفسی میں پھنسوں۔ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سُنی سنائی سید صاحب کی اولو العزمی اور دردمندی اہلِ اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہارِ محبت کروں تو بجا ہے مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سُن سُن کر ان کا شاکی اور اُن کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔ مجھ کو ان کے کمال دانش سے یہ اُمید تھی کہ میرے اس ربع کو ثمرہ محبت سمجھ کر تہ دل سے اپنے اقوال میں مجھ سے استفسار کرینگے بایں خیال کہ ؎

گاہ باشد کہ کودک ناداں + بغلط بر ہدف زند تیرے

اس طرف کو دل لگائیں گے، مگر اُن کی اس تحریر کو دیکھ کر دل سرد ہو گیا اور یہ یقین ہو گیا کہ کوئی کچھ کہو وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔ اُن کے انداز تحریر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے اس لئے جی میں یہ آتا ہے کہ قلم ہاتھ سے ڈال دیجئے۔ مگر کیا کروں آپ کا تقاضا جدا جان کو کھائے جاتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کا ارشاد جدا ہی ڈراتا ہے گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ جب بے کہے نہ بنی تو قلم کو روک روک کر کچھ مختصر مختصر ایک بار عرض کر دینا مناسب جانا اور جی میں یہ ٹھانا کہ ہرچہ بادا باد پھر قلم نہ اُٹھانا کہیں مدلل، کہیں بے دلیل ایک بار تو اپنے مافی الضمیر کو لکھ کر روانہ کرائیے۔ اگر سید صاحب نے انصاف فرمایا تو پھر بھی دیکھا جائے گا ورنہ اپنے حق میں کوئی جابر نہیں جو مجبوری کا اندیشہ ہو۔ بہرحال بترتیب اُصول سطور سید صاحب یہ معروضات معروض ہیں۔

نہ زیادہ حکمت بلقمان آموختن است "اللہ یھدینا و یھدیکم الی سواء الصراط واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم ط (محمد قاسم)

خطوط کی اخلاقی قدریں

مذکورہ بالا دونوں خطوط پیر جی محمد عارف صاحب کے نام ہیں

اور دونوں مقتدر ہستیاں پس پردہ ہیں سر سید کا یہ جملہ "اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ہے میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا" بہت ہی قابلِ قدر ہے جس سے سر سید کے دل میں مولانا کی وقعت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو کہ دونوں حضرات مولانا مملوک علی صاحب صدر عربک کالج دہلی کے شاگرد تھے۔

حضرت قاسم العلوم کا یہ فرمانا "اس میں کچھ شک نہیں کہ سُنی سُنائی سید صاحب کی اولو العزمی اور دردمندی اہلِ اسلام کا معتقد ہوں اور اسی وجہ سے ان کی نسبت اظہارِ محبت کروں تو بجا ہے" اپنی

جگہ سرسید کے متعلق منصفانہ طبیعت کا آئینہ دار ہے۔

مگر سرسید نے مذکورہ عقیدتمندانہ خیال کے بعد یہ لکھ کر کہ ؎

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدۂ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا

تمام عقیدت پر پانی پھیر دیا ہے۔ مگر حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ بجائے خود شاعر اور بلا کے حاضر جواب نظر آتے ہیں۔ آپ نے طنز کا جواب غالب کی اُسی غزل کے حسبِ ذیل شعر ؎

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
میں کہوں گا حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

سے دیکر ترکی بترکی کا کام کیا ہے۔ مگر اہلِ علم و فضل کی طنزیہ باتیں بھی دائرۂ ادب میں لطافت و ملاحت سے خالی نہیں۔ حضرتؒ بے تاب ہیں کہ سرسید کے عقائد کی اصلاح فرمائیں لیکن اُن کا دل یہ دیکھ کر بجھ گیا ہے کہ سرسید نے غالب کا شعر لکھ کر افہام و تفہیم کی راہیں بند کر دی ہیں۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ کو سرسیدؒ سے کہنا پڑا ہے کہ "مجھ کو اُن کے کمالِ دانش سے یہ اُمید تھی کہ میرے اِس رنج کو ثمرۂ محبت سمجھ کر تہ دل سے اپنے اقوال میں مجھ سے استفسار کریں گے۔" نیز مولٰنا نانوتوی کا سرسید کے رویہ سے یہ معلوم کر لینا کہ وہ کسی صورت بھی ان کی بات نہ مانیں گے تو مولٰنا یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ "اُن کی اس تحریر کو دیکھ کر دل سرد ہو گیا کہ کوئی کچھ کہو وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔" اُن کے اندازِ تحریر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے۔"

انصاف یہ ہے کہ یہاں سرسید کی طرف سے فرار کی شکل نظر آتی ہے درانحالیکہ مولٰنا نانوتوی نے پیرجی صاحب اور مولٰنا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار پر یہ خط تحریر فرمایا تھا۔ ورنہ انھوں نے اپنی قلبی کیفیت کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے

"پیرجی صاحب! یہ گمنام کبھی کسی سے نہیں اُلجھا اور اُلجھے بھی تو کیوں کر اُلجھے، وہ کونسی خوبی ہے جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار ہو۔ ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عُمدہ مشاغل چھوڑ کر اسی نفسا نفسی میں پھنسوں۔"

لیکن ایک طرف سرسید کی ہمدردی اور دوسری طرف تبلیغی فریضہ کی بجاآوری مولٰنا نانوتوی کو محسنِ قوم کی اصلاح کے لئے میدان تحریر میں لے آتی ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"کہیں مدلل اور کہیں بے دلیل ایک بار تو اپنے مافی الضمیر کو لکھ کر روانہ کر دیئے اگر سید صاحب نے انصاف فرمایا تو پھر بھی دیکھا جائے گا ورنہ اپنے حق میں کوئی جابر نہیں جو مجبوری کا اندیشہ ہو۔"

یہ تو مولٰنا نانوتویؒ اور سرسید کی اخلاقی قدروں کا جائزہ تھا۔ لیکن میرا مطمحِ نظر حضرت قاسم العلوم علیہ الرحمۃ کی خط نویسی اور انشاء نگاری پر تبصرہ کرنا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے مذکورہ مکتوب کا ادبی جائزہ

حضرت نانوتوی کے مکتوب گرامی اور سرسید کے مذکورہ خط کی اخلاقی قدروں پر تبصرہ ہو چکا۔ لیکن جہاں تک ادبی تنقید کا تعلق ہے مولٰنا کے مکتوب میں حسب ذیل عبارتی ٹکڑے ادبیت کا گہرا رنگ رکھتے ہیں اور خود اپنے حسنِ زبان کی طرف جاذب نظر آتے ہیں، مولٰنا تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ ہی فرمائیں کہ ہم سے گرفتاروں کو اتنی رہائی کہاں کہ بنارس، غازیپور اُڑ جائیں، اور ہم سے بیچاروں کو اتنی رسائی کہاں کہ سید صاحب کے در دولت تک نوبت پہنچائیں۔"

"تس پر نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔" "اجی حضرت! امیروں کے ذہن و فہم و عقل و ادراک کے ہزاروں گواہ ہوتے ہیں، غریبوں کے فہم و فراست کا کہیں ایک بھی نہیں سُنا اس صورت میں کیوں کر کہہ دیجئے کہ سید صاحب ایک غریب سے شہزادہ کی مان جائیں۔"

مذکورہ عبارتوں کے ٹکڑے جو مسجع و مقفیٰ بھی ہیں اور جن میں پوری بہار کے ساتھ روزمرہ اور محاورہ اپنا رنگ دکھا رہا ہے، پوری کی پوری عبارت شگفتہ، سلیس، فصیح اور بلیغ ہے۔ تس پر غالب کے شعر کا، غالب کی اسی غزل کے شعر اور حسب ذیل شعر ؎

؎ کب وہ سُنتے ہیں کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

سے جواب، بلاغت کے تمام مقتضیات کو پورا کر رہا ہے۔

اِس خط کے اخلاقی اور ادبی پہلوؤں پر تبصرہ کے بعد اب میں حضرت قاسم العلوم کے ایک مکتوب کا تھوڑا سا ابتدائی حصّہ جو انہوں نے مولوی جمال الدین شاہ کو سماع موتی کے سلسلے میں لکھا ہے، پیش کر کے مکتوبات پر تنقید کا سلسلہ ختم کرتا ہوں۔

حضرت نانوتوی مولوی جمال الدین صاحب کو لکھتے ہیں:-

مکتوب قاسمی بنام مولوی جمال الدین صاحب

"مخدوم و مخدوم زادۂ آفاق جناب مولوی سیّد محمد جمال الدین شاہ صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ۔ یہ آپ کا نیازمند محمد قاسم اول سلام مسنون عرض کرتا ہے، اور پھر یہ عرض کرتا ہے۔ چند روز ہوئے آپ کا عنایت نامہ میری سرفرازی کا باعث ہوا، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس تقصیر تاخیر جواب کا عذر پیش کرتا ہوں، انشاء اللہ تعالیٰ تامقدور فی الفور جواب نامہ عرض کرتا جواب سوال بن پڑتا یا نہ بن پڑتا، پر کیا کروں ان دنوں یہ خستہ جاں مبتلائے بلا تھا۔ داڑھ کے درد نے ایسا بے تاب و تواں کر رکھا تھا کہ کیا عرض کروں۔ اس کے بعد ناتوانی نے کچھ بہونے دیا وہ کچھ کم ہوئی تھی تو کچھ کچھ اعضاء شکنی اور خفیف سا بخار دمساز رہنے لگا۔ ہمت تو آج بھی جواب دیتی ہے مگر کب تک یہ انتظار کیجیے کہ طاقت آئے اور نقاہت جائے، اور میں جواب لکھوں۔ اپنی معلومات ہی کتنی ہے جس کے واسطے اتنا انتظار کیجیے اور آپ کو انتظار کرائیے۔ جو کچھ ہے ابھی عرض کئے دیتا ہوں۔ سماع اموات کے قصّے میں اوّل تو یہ معروض ہے کہ یہ امر قدیم سے مختلف فیہ ہے دوسرے ضروریات دینی اور عقائد ضروریہ میں سے نہیں۔ اس کی تنقیح قرار واقعی تو بعد مرگ ہی معلوم ہوگی۔ اگر بعد مرگ ہم نے اوروں کا سلام و پیام سُن لیا تو سماع نہیں۔"

(جمال قاسمی ص۸)

اِس خط پر ادبی حیثیت سے کوئی تنقید میرا مقصد نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ قاسم العلوم کے اس مکتوب میں آداب، القاب کا طرز وہی پرانا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مولٰنا اپنا اسم گرامی بعض خطوط میں کتابی طرز پر آداب و القاب کے بعد بھی تحریر فرماتے تھے اور کتنے ایک خطوط میں خاتمے پر نام تحریر فرماتے تھے۔ خط کے آخر میں دستخطوں کا طرز جیسا کہ جمالِ قاسمی کے پہلے مکتوب (مدة الوجود) کے آخر میں ہے اِس طرح ہوتا تھا [illegible] تاریخ کبھی نام کے بعد ہوتی تھی اور کبھی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ جمال قاسمی کے دوسرے مکتوب کے آخر میں اپنا نام لکھ کر حضرت نے تاریخ اس طرز میں تحریر فرمائی ہے۔ (سوم ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ نبوی روز چہارشنبہ)

میرا مقصد حضرت قاسم العلوم کی خطوط نویسی پر سیر حاصل تبصرہ سے یہ ہے کہ فصیح خطوط جن کو ادب کے سلسلہ کی ایک کڑی سمجھا گیا ہے اِسی سلسلہ میں حضرت مولٰنا کے خطوط کی قدریں ادب کا بہترین سرمایہ ہیں اور یہ کہ مولٰنا کے خطوط فصاحت سلاست، سادگی، بے ساختگی، طرزِ تخاطب میں بات چیت کے سے انداز کی سی خوبیاں رکھتے ہیں۔ (باقی باقی)

ماہنامہ "الصّدیق" ملتان (پاکستان)
(کے)
۲ دو خصوصی شمارے "صحابہ نمبر" اور "خاتم النبیین نمبر" شائع ہو چکے ہیں اس کے بعد "برکات" اور "سلام نمبر" اور "صفہ نمبر" جس میں اصحاب صفہ کے حالات ہیں عنقریب شائع ہونیوالے ہیں۔ اگر آپ یہ سب نمبر اور اختتام سال تک مزید پرچے بھی لینا چاہیں، تو صرف مبلغ پانچ روپے ارسال فرما کر یہ تمام نمبر لے سکتے ہیں اور اختتام سال ۸۳ھ "الصّدیق" حاضر خدمت ہوتا رہیگا
ہندوستانی حضرات کے لئے روپیہ جمع کرانے کا پتہ:-
"مولٰنا مجید حسن صاحب مالک اخبار "مدینہ" بجنور (انڈیا)
المعلن
ادارہ "الصّدیق" ملتان (پاکستان)

"ادب کی شرعی حیثیت"

(حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ)

"مولوی عبدالرحمن خاں صاحب جھلیک (ملتان) نے اسلامی آداب و اخلاق پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں مخدومی حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے چند فقرے نقل کئے گئے ہیں، مصنف مذکور نے مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کی سفارش کے ساتھ فرمائش کی کہ ان جملوں کی تشریح فرمائی جائے۔

حضرت مہتمم صاحب نے ذیل کی تحریر اسی موضوع پر مرتب فرمائی ہے، یہ تحریر خواص کے لئے بصیرت افزا، اور عوام کے لئے مفید ہے۔" (مدایر)

جناب محترم و مکرم زید فضلہم

سلام مسنون نیاز مقرون۔ مکرمت نامہ موصولہ ۱۴ محرم الحرام سنہ ۷۳ھ باعث مشرف ہوا۔ آپکے سلسلۂ تالیفات میں "داستانِ عمل" اور "اخلاق و آداب" جیسی مفید اور قیمتی کتابوں کے اضافہ سے بیحد مسرۃ ہوئی۔ ان دونوں کتابوں پر دو جلیل القدر عالموں کے دیباچہ کا اضافہ نورٌ علیٰ نور اور مستفیدوں کے لئے سرور فوق سرور کا مصداق ہے۔ آں محترم نے احقر کے چند فقرے نقل کرکے اُن پر اضافہ و تشریح کا ایماء فرمایا ہے جس میں حضرت مخدومی مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہٗ کا ارشاد بھی شامل ہے۔ آپکا ہی ایماء کیا کم تھا اب جبکہ اس میں ایک اور بھاری اشارہ کے بوجھ کا اضافہ بھی ہوگیا ہے تو اُسے ضعیف کندھوں پر لادے پھرنے کی ناقابلِ برداشت کیفیت سے یہ بوجھ ہلکا نظر آیا کہ فوراً ہی تعمیل کروں، پھر بھی جو تاخیر ہوئی، وہ میرے سفروں کی وجہ سے ہوئی۔ جناب کا والا نامہ دیوبند اُس وقت پہنچا جبکہ میں بمبئی گیا ہوا تھا، وہاں سے واپس آیا تو فوراً ہی لکھنؤ کا سفر پیش آگیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو مجلس شوریٰ دار العلوم کا سالانہ جلسہ سر پر آگیا، اُس سے فراغت ہوئی تو علیگڈھ، کانپور کا سفر درپیش ہوگیا۔ اس لئے آج واپس ہو کر شب میں بعد عشاء جو کچھ بن پڑا بطور تعمیل ارشاد سطورِ ذیل قلمبند کیں اور بلا نظرِ ثانی ہی ارسال ہیں مناسب ہو کر جناب یا حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہٗ اُن پر ایک اصلاحی نظر فرمالیں۔ یہ مضمون فی الحقیقت احقر کے اُن تین ہی جملوں کی شرح ہے جو جناب نے نقل فرما کر بھیجے ہیں اس لئے مضمون کا آغاز انہی سے کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں:-

علم کی غایت عمل ہے،
اُس کا جوہر تقویٰ ہے،
اُس کا زیور ادب ہے،

(۱)

شاعروں کا ادب لفظی میدانوں میں دوڑنے والے شاعروں کے یہاں ادب کے معنی شستہ کلامی اور بلاغت بیانی کے ہیں۔ حفظ اشعار، حفظ لغات اور حفظ اسماء و اصطلاحات اس ادب کی پونجی ہے۔ شاعری یا مرصع نثر گوئی اور جملوں کے جوڑ بند کی صنعت گری اس ادب کے میدان کی مساعی جمیلہ ہیں۔ خیال آفرینی اور تخیل کے میدانوں کی نقشہ سازی اس ادب کا جوہر ہے۔ معنویت یا واقعیت براہِ راست شاعر کا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف تخیل کی کارگذاری اور خیال آفرینی مطمح نظر ہوتی ہے۔ اسی لئے اشعار اور شاعرانہ تعبیرات کے ساتھ کبھی واقعیت جمع ہو جاتی ہے، اور کبھی نہیں۔ لفظی دُنیا میں اسی کو ادب اور اس قسم کے کلام والے کو ادیب کہتے ہیں۔ اس ادب کی غرض و غایت اکثر و بیشتر داد خواہی اور زر طلبی ہوتی ہے۔ سامعین کی تحسین و آفریں اور مدح سرائیوں پر

ممدوحوں کی داد و دہش اِس ادب کی انتہائی معراج ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے ایک پرلے درجہ کا بے ادب اور علم سے بے بہرہ حتی کہ فاسق و فاجر بھی اپنی طبعی ذہانت و ذکاوت اور موزون طبیعت سے شستہ کلامی پر قادر ہو سکتا ہے درحالیکہ اُس میں علم کا کوئی بھی جوہر نہو۔ جہلاءِ عرب بلند پایہ شاعر بزلہ گو، برجستہ کلام اور فصاحت بیانی کے پُتلے تھے اُس وقت کی دُنیا میں اُن کی بلاغت بیانی کی کوئی مثال نہیں ملتی اور اسی لئے اُنہوں نے اپنے سوا ساری دُنیا کے لئے عجم (گونگا) کا لقب تجویز کیا تھا مگر با ایں ہمہ تھے وہ جہلاء ہی، حتی کہ ان کی بے مثال جہالت کی بناء پر ہی اُن کے زمانہ کا نام تک زمانہ جاہلیت ہوا، کہ انہیں علم سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا "تا بادب و تقوے چہ رسد"۔

اِس ادب کے ہزار ہا ادیب اُمراء و سلاطین کے درباروں میں نظر آتے ہیں جو اپنی قصیدہ خوانی ہی کی بدولت معاش پیدا کرتے تھے، اور زبان اور زبان کے لفظوں کی بدولت اُن کی گذر بسر ہوتی تھی، آج کی دُنیا میں جبکہ دربار نہ رہے صرف بازار رہ گئے شاہیت نہیں صرف عوامیت ہے تو قومی اسٹیجوں اور عوامی نشر گاہوں سے اسی ادب کے باربردار سینکڑوں ادیب قومی مرثیہ گوئی یا قومی مدح سرائی سے معاش کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اِس سے واضح ہے کہ یہ ادب علم کی آرائش اور اس کا زیور نہیں کیوں کہ اس ادب کے لئے سرے سے علم ہی ضروری نہیں، زیورِ علم کا تو سوال ہی کیا پیدا ہو۔ اس ادب کا حاصل خود غرضی اور غیر فرضی یا اپنی خواہشِ داد اور مخاطب کی رضا جوئی کے سوا کچھ نہیں جس کا خلاصہ قرآنی الفاظ میں صرف یہ ہے کہ:۔

يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ	"وہ تمہیں اپنے موہنوں (زبانوں اور زبانی لفظوں) سے راضی کرنا چاہتے ہیں حالانکہ اُن کے دل اس سے انکاری ہیں اور اکثر اُن میں فاسق ہیں"۔

اسی لئے اللہ نے اس ادب اور اُس کے سرچشمہ (شاعری) کو اپنے پیغمبر سے الگ اور دور رکھا اور فرمادیا کہ یہ شاعری پیغمبر کے لئے زیبا بھی نہ تھی کہ اس ادب کا حاصل خیال آرائی تھا اور پیغمبروں کا موضوع حقیقت آرائی اور حقیقۃ الحقائق تک رہنمائی تھی۔ عارف و کامل شعراء جیسے عارف رومی سعدی، عطار، اور سلف و خلف کے دوسرے شعر گو اکابر دلوں میں اگر با عظمت ہیں تو شاعری کی بدولت نہیں بلکہ معرفت کی بدولت یعنی بحیثیت شاعر کے مقدس نہیں مانے گئے بلکہ بحیثیت کمالِ باطن کے اِس لئے اس قسم کے اکابر سے مذکورہ بالا نظریہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

(۳)

عامیوں کا ادب

عوام الناس کے عُرف میں ادب کے معنی احترام و تعظیم کے ہیں مگر انہیں کے مروجہ رسمی اقوال و افعال اور بندھی جُبڑی رسموں اور ہیئتوں کے ساتھ۔ اُن ہی رسومِ تعظیم کے ساتھ جب کوئی اُن سے پیش آتا ہے تو وہ اُسے با ادب اور مہذب کہتے ہیں ورنہ بے ادب اور گُستاخ کہہ کر خشمگین ہو جاتے ہیں۔ برادریوں کے اجتماعات اور قبائلی تقریبات، یا عام میل جول میں کسی چھوٹے کا جھک کر ہاتھوں سے سلام کرنا یا مُنڈی گود میں ڈال دینا یا اصلاحی الفاظ میں تعظیمات و تسلیمات اور آداب بجالانا یا نیم جھکاؤ کے ساتھ سامنے کھڑے ہو کر جھک جانا، یا ہاتھ جوڑ کر سر و قد کھڑے ہونا یا چچا جان یا بھائی جان کے خطاب سے مخاطبوں کو متوجہ کرنا اُن کے یہاں ادب اور ان الفاظ و ہیئات کو من و عن ادا کر دینے والا مستادب اور ادیب کہلاتا ہے۔ خواہ اُس کے دل میں مخاطبوں کی طرف سے کتنا ہی غبار بھرا ہوا ہو اور وہ برادری کی اونچ نیچ کے تعینے ہی منافقانہ اور عصبیاتی جذبات دل میں لئے ہوئے ہو جو اپنے وقت پر کافی جوش و خروش سے اُبھرتے ہوں۔ اور محبت کے بجائے عداوت کے جذبات دل کے تمام گوشوں میں چھپے پڑے ہوں جو اپنے وقت پر پھوٹ پڑیں مگر برادری یا شہری رسم کے مطابق اُسے متادب ہی کہا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب بھی وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ان رسم پرستیوں کے لئے نہ صرف یہی کہ علم ضروری نہیں ایک حد تک جہل ضروری ہے۔ اس ادب کا حاصل نمائش اور ظاہر داری ہے جس کے پیچھے حقیقت و معنویت کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس ادب کی مدح خود غرضی نفس اور رضا جوئی غیر تو نہیں

ہوتی بلکہ برادری کی عام ملامت سے اپنے کو بچاتے ہوئے برادری میں اپنی شمولیت کو باور کرانے کی کوشش اور رسوم اہل زمانہ کے مطابق تصنع اور بناوٹ سے اپنے کو بھاری بھرکم ظاہر کرنا ہوتا ہے مخاطب کی حقیقی عظمت و توقیر کا اکثر و بیشتر یہاں کوئی سوال نہیں ہوتا، جبکہ برادرانہ مناقشات کے تحت دل اُس کی بُرائیوں سے بھرپور ہوتے ہیں اس رسمی شائستگی اور ظاہرداری کی حقیقت قرآنی تعبیر سے یوں بیان کی جاسکتی ہے:۔

يعلمون ظاهراً من الحيوة الدنيا وهم عن الآخرة هم غافلون۔ "یہ لوگ دُنیا کی زندگی کی صرف ظاہرداریوں کو جانتے ہیں اور انجام وعاقبت سے یکسر غفلت میں ہیں"

(۳)

مدعیوں کا ادب

مدعیانِ علم کے یہاں جن کی زبانیں تو علم سے آراستہ ہوں مگر قلوب خشوع سے خالی ہوں۔ ادب کے معنی یقیناً لفظی صنعت گری، یا عرف عام کی مروجہ رسموں کی پابندی کے تو نہیں بلکہ خدا اور رسول اور اکابر دین و دُنیا کے احترام کے لئے شریعت ہی کے بخشے ہوئے افعال و ہیئات اور صریح حکم فرمودہ اعمال کی پابندی کے ہیں بشرطیکہ ان کے بارے میں اُنہیں صراحتاً لفظوں میں کوئی حکم ملجائے اور کوئی شبہ نہیں کہ ادب کا یہ بہت پاکیزہ اور اعلیٰ ترین معیار ہے جس میں شرعی ہیئتوں کی پابندی پائی جارہی ہو لیکن جب کہ اس قسم کے مدعیانِ علم نے علم کے محض الفاظ ہی یاد کئے ہیں مگر اُس کی حقیقی کیفیات سے اُن کے قلوب باکیف نہیں اور ساتھ ہی ریاضت نفس سے بے پرواہ رہنے کے سبب قلب میں جبلت کے غیر معتدل اخلاق اور ہوا و ہوس کا غلبہ ہے نیز جذباتِ نفسانی بیدار ہیں تو قدرتی طور پر ان شرعی ہیئتوں کی پابندیوں میں بھی اُن کے قلوب کی وہ ظلمانی کیفیات جھلکنی ناگزیر ہیں جو اُن کا جوہر نفس بنی ہوئی ہیں وہ بظاہر شرعی آداب کی پابندی کرتے ہوئے بھی مخاطب کی طرف سے کینہ و حسد اور کدورت رکھ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں جو جذباتِ نفس اور جبلی کدورتوں کی آمیزش کے ساتھ شرعی رسوم کی پابندی اُن ہی رواجی رسوم کی پابندی کی طرح محض رسمی اور نمائشی ہوکر رہ جائے گی جن کے خوگر عوام تھے فرق اتنا ہوگا کہ عوام رواجی رسوم کے پابند ہوں گے اور یہ عوام اہل علم یعنی مدعیان علم شرعی رسوم کے پابند۔

(گو اس رسم کے درجہ میں وہ عوام سے فائق اور قابلِ تحسین بھی ہوں) مگر جیسے دُنیا دار لوگ فساد باطن کے ساتھ مخاطب کا ظاہری ادب کرتے ہوئے بھی قلباً اُس کے حق میں بے ادب اور گستاخ ہوتے ہیں ایسے ہی یہ مدعیانِ علم بھی بلا خشوع باطن شرعی صورت کا ادب برتتے ہوئے بھی مخاطب کے حق میں گستاخ اور بے ادب کہلائے جانے کے مستحق ہوں گے چنانچہ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے اہلِ علم قلبی عقیدت و انقیاد جذبۂ عشق و گرویدگی اور حقیقی نیازمندی سے خالی رہ جانے کے سبب گو بظاہر لفظی ادب و احترام اور رسمی آداب و تعظیمات سے گریز نہیں کرتے مگر اُن کے ادب کی رسوم میں ذاتی فخر و غرور کی کیفیات ضرور شامل ہوتی ہیں جس سے کبھی تو اُن کی زبانِ قال پر تعلّی شیخی اور اپنے علم و ادب پر گھمنڈ کے کلمات آتے ہیں گویا وہ خدا اور رسول پر اور اُن کے نام لیواؤں پر احسان جتلاتے ہیں کہ وہ اُن کا کتنا ادب کرتے ہیں، اور کبھی وہ اُن ہی مخاطبوں کے بارے میں جس کے ادب کے وہ زبان اور رسوم ادب سے مدعی تھے بے ادبی گستاخی اور بے باکی کے لب و لہجہ بلکہ گستاخانہ کلمات سے بھی نہیں چوکتے۔ پس بظاہر تو وہ ادب ہوتا ہے اور بباطن بے ادبی کیونکہ بظاہر تو وہ اتباعِ رسوم شریعت ہوتا ہے مگر رنگِ بے ادبی شامل ہوجانے سے وہ درحقیقت اتباع نہیں ابتداع بن جاتا ہے کیوں کہ صاحب شریعت نے اس رنگ کے ساتھ انھیں اتباع نہیں بتلایا تھا۔ بلکہ جیسے احکام کی تعلیم دی تھی ویسے ہی اُن کے برتنے کا رنگ ڈھنگ بھی خود ہی دیا تھا جسے انہوں نے بدل کر اس میں اپنا جدید رنگ بھر دیا جو اگرچہ حکم کی بدعت نہیں مگر رنگ حکم کی بدعت ضرور ہے۔ بہرحال اس رنگ تعلّی و کبر اور عُجب و ریا کے ڈھنگ سے رسوم شرعیہ کی پابندی حقیقی ادب و تعظیم نہیں بلکہ تکبر بصورت تواضع اور فسق بصورت تقویٰ ہوتا ہے جسے وہ دھوکہ میں رہ کر ادب و تقوے ہی سمجھے رہتے ہیں مگر وہ تقوے کے آس پاس بھی نہیں ہوتے۔

پس یہ ادب بجائے خود ایک مستقل دھوکہ اور تلبیس بلکہ ایک مستقل فساد ہوتا ہے جس سے ہزار ہا بے بصر عوام الناس کی راہ ماری جاتی ہے، صاحب ہدایہ نے ایسے ہی عوام اہلِ علم کے لئے فرمایا ہے:۔

فسادٌ کبیرٌ عالمٌ متہتکٌ
واکبر منہ جاہلٌ متنسکٌ
ھما فتنۃٌ فی العٰلمین کبیرۃٌ
لمن بھما فی دینہ یتمسکٌ

"دُنیا میں وہ عالم فسادِ عظیم ہے جو پردہ دری کرے اور بے ادب ہو۔ اور اس سے بڑھ کر وہ جاہل ہے جو بلا علم کے عبادۃ کرے (من گھڑت بدعات میں مبتلا)، یہ دونوں کے دونوں دُنیا میں ایک عظیم فتنہ ہیں ہر اُس شخص کے لئے جو دین میں اُن سے رہبری حاصل کرے اور حجۃ پکڑے۔"

حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے:۔

احذروا من الناس صنفین عالم قد فتنہ ھواہ و صاحب دنیا قد اعمتہ دنیاہ۔

"دو قسم کے آدمیوں سے بچو ایک اُس عالم سے جو ہوا و ہوس میں مبتلا ہو، اور ایک اُس دُنیا دار سے جسے دُنیا نے اندھا کر دیا ہو۔"

ظاہر ہو کہ اس ادب کو اُس ادب سے کوئی واسطہ نہیں جو علم کا زیور کہلاتا ہے۔ کیوں کہ اس ادب میں صورتِ تقویٰ تو بنی رہتی ہے مگر تقوائے باطن ندارد ہوتا ہے کیوں کہ تقوائے باطن کے ساتھ دعویٰ شیخی۔ کبر نفس، غرور اور علم پر گھمنڈ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ فنائیت، محویت، کمال تواضع اپنی حقارت اور مخاطب کی عظمت و توقیر کے جذبات باطن نفس میں جمع ہوئے ہوتے ہیں اس لئے یہ ادب تو ہے مگر رنگِ ادب سے خالی ادب ہے مگر ذوقِ ادب سے مبرا یعنی صورت ادب ہے ادب نہیں۔ حالانکہ صورت ادب کے ساتھ ذوقِ ادب اور رسم ادب کے ساتھ کیف ادب کی بھی ضرورت ہے۔

عالموں کا ادب

لیکن اگر ادب شرعی رسوم کے ساتھ ان کی حقیقی کیفیت بھی قلب میں ہو اور یہ صورت ادب بے رُوح ڈھانچہ نہ ہو بلکہ باکیف رسم ہو تو حقیقی ادب کہلائے گا، اور ادب کی اس کیفیت کے غلبہ کے بعد متادب اور ادیب نہ صرف مخاطب کے اوامر و احکام ہی کو پیش نظر رکھے گا بلکہ اُس کے منشا اور اشارۂ خم ابرو کو بھی دیکھے گا اور ایسا متادب مخاطب کے صرف منصب ہی کو نہیں دیکھتا، بلکہ اُس کی ذاتی عظمت و برگزیدگی کو بھی پیش نظر رکھتا ہے جس سے اُس کے ادب کی ذمہ داریاں رسوم سے گذر کر حقائق تک پہونچ جاتی ہیں اور وہ صرف زبان یا ہیئۃ بدن ہی سے ادب دان نہیں رہتا، بلکہ دل و دماغ اور نفس و روح سے بھی ادب و توقیر کا ثبوت دیتا ہے، نیز اس مقام کے لحاظ سے اُس پر ادب و عظمت کے وہ دقیق دقیق معارف کھل جاتے ہیں جو عوام اور مدعیانِ علم کو محض لفظوں میں نظر نہیں آسکتے بلکہ اس صاحب معرفۃ پر ہی روشن ہوتے ہیں۔ اندریں صورت عظمت والا مخاطب اگر اس متادب سے ایک پھول چاہے گا تو وہ باغ دینے کو تیار ہو جائے گا وہ اگر بدن کا ادب مانگے گا تو یہ رُوح سے بھی ادب کرے گا وہ اگر افعال کا ادب چاہے گا تو یہ طبیعت اور اخلاق تک کے ادب کے نمونے پیش کردیگا یعنی ظاہر و باطن سے اس حد تک ادب دان ہو جائے گا کہ اُس کا ذوق تک ادب کے سانچوں میں ڈھل جائے گا۔ یہی وہ کمالِ ادب کا مقام ہے جو خواص کو نصیب ہوتا ہے اسی کو ہم اہل تدین اور عالموں کا ادب کہیں گے۔ مدعیان علم کا ادب نہیں۔ پس عالموں اور دینداروں کے یہاں ادب کی حقیقت لفاظی یا نقاشی یا لفظ و ہیئت کی صنعت گری نہیں بلکہ نیاز مندیٔ باطنی اور فدویت روح و طبیعت کے ساتھ شرعی آداب کے ڈھانچوں کو سنبھالنا اور پابندیٔ احکام کے ساتھ ساتھ احکام کی آخری اور قدرتی حدود کو جو ذوقِ سلیم اور مشق شریعت سے سامنے آتی ہیں ہر وقت زیر نظر رکھنا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ نہ اُس میں ادعا ہو نہ گھمنڈ نہ شیخی ہو نہ اتراہٹ نہ اپنی توقیر ہو نہ دوسروں کی تحقیر نہ روایت ہو، نہ حکایت بلکہ محویت و گرویدگی ہو اور فنا نفس کے ساتھ رضاء حق کے جذبات کام کر رہے ہوں۔ بس یہی وہ ادب ہے جسے علم کا زیور کہا گیا ہے پس جس طرح ایک خوبصورت پیکر کا حُسن و جمال زیور سے آراستہ ہو کر دو نا ہو جاتا ہے ایسے ہی علم حقیقی کا جمال زیور ادب سے آراستہ ہو کر ہزاروں گُنا بڑھ جاتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ادب اُن احتیاطی افعال اور تقوائے اعمال کا نام ہے جو اعمال شرعیہ کی حفاظتی اور انتہائی حدود سے متعلق ہوں۔ پس ادب

کا ابتدائی درجہ تو یہ نصوص شرعیہ کی عبارت پر عمل کرنا ہے اور اُس کا آخری درجہ وہ ہے جو اس عمل کی مشق و تکرار سے ان ہی نصوص کی دلالت و اشارت اور اقتضاء سے ذہن پر منکشف ہو اور اگر ظواہر نصوص کے تعبیری حکم کو فتویٰ کہا جائے گا تو اس اقتضائی و دلالتی اور اشاراتی حکم کو تقوے کہا جائے گا۔ پس صحیح معنی میں ایک متأدب اُسی وقت ادب داں بنتا ہے جبکہ عملی طور پر اُس کے سامنے ادب کے یہ تمام ظاہری و باطنی اور فتوائی و تقوائی احکام اور حدود موجود ہوں اور وہ دل کی آمادگی اور اُمنگ سے اُن پر عمل پیرا ہو۔ یہاں تک کہ انجام کار ادب کی ذوقی حدود بھی اُس پر منکشف ہو جائیں یعنی وہ نصوص کے دقیق اور بعید سے بعید محتملات تک کو بھی اپنے ادبی پروگرام میں شامل رکھنے کا خوگر ہو جائے گویا فنافی الادب ہو جائے یہی وہ ادب ہے جس کو علم کا زیور اور تقویٰ کا جوہر کہا گیا ہے۔ کسی نیک عمل میں اُس وقت تک نور نہیں آسکتا جب تک کہ اُس کا ادب اُس میں شامل نہو اور وہ احتیاطی اور تقوائی حدود زیر عمل نہوں جس سے اس عمل کی حقیقی جامعیت اور اس کا واقعی کمال و جمال وابستہ ہے۔ پس ادب ہی فی الحقیقت علم کا زیور اور عمل کا جوہر ہے اُس کے بغیر عمل ایک بے لباس اور بے زینۃ پیکر ہے جس کی طرف رغبت و شوق کی نگاہیں نہیں اُٹھ سکتیں اس سے بسہولت اندازہ ہو سکتا ہے کہ اعمال بغیر آداب کے قبولیت کے مقام پر نہیں پہونچ سکتے اور اُن کا حقیقی ثمرہ اور صلہ بغیر آداب کے سامنے نہیں آسکتا۔ پس جیسا کہ ہر صنعت کے تجربہ کار پر بالآخر اُس صنعت کے وہ دقائق بھی بقدر استعداد کھلنے لگتے ہیں جو دوران تعلیم میں کتابوں سے اس کے سامنے نہ آئے تھے ایسے ہی آداب شرعیہ کی ابتدائی عملی حدود تو نصوص شرعیہ کی لفظی تعبیرات اور عبارت میں موجود ہوتی ہیں لیکن اُن پر مستمراً عملدرآمد کی مشق سے جبکہ ذوقِ ادب اور نیازمندی و فدویت کا ملکۂ راسخہ باطن میں پیدا ہو جاتا ہے تو ادب کی بہت سی وہ ذوقی راہیں بھی قلب پر کھل جاتی ہیں جو ان نصوص کی عبارت سے گذر کر اُن کی دلالت و اشارت میں پنہاں ہوتی ہیں اور پھر آدمی ادب کو استعمال نہیں کرتا، بلکہ ادب اُسے استعمال کرنے لگتا ہے جن سے وہ ادب میں غرق اور فنا ہو کر سر تا پا ادب بنجاتا ہے اور پھر اُس سے آداب کے وہ نقشے سرزد ہوتے ہیں جو عام نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتے۔

عربی زبان کی بہترین تفسیر

تفسیر مظہری!

علماء، طلباء اور عربی مدرسوں کیلئے

شاندار تحفہ!

مختلف خصوصیات کے لحاظ سے "تفسیر مظہری" تفسیر کی تمام کتابوں میں بہترین سمجھی گئی ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے اپنی مثال نہیں رکھتی، حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم الشان تفسیر کے بعد کسی تفسیر کی ضرورت نہیں رہتی، امام وقت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ کے کمالات علمی کا یہ عجیب و غریب نمونہ ہے، اس بینظیر تفسیر کا پورے ملک میں ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔ شکر ہے کہ برسوں کی جد و جہد کے بعد آج ہم اس لائق ہیں کہ اس متبرک کتاب کے شائع ہونے کا اعلان کر سکیں۔ تقریباً تمام جلدیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں صرف آخری جلد جس میں دو پاروں کی تفسیر ہے زیر طبع ہے۔

(ہدیہ غیر مجلد)

جلد اوّل = سات روپے　　جلد ثانی = سات روپے
جلد ثالث = آٹھ روپے　　جلد رابع = پانچروپے ۸ آنے
جلد خامس = سات روپے　　جلد سادس = آٹھ روپے ۸ آنے
جلد سابع = آٹھ روپے　　جلد ثامن = آٹھ روپے۔
جلد تاسع = پانچروپے　　جلد عاشر = (زیر طبع)

رعایتی ۶۰ ساٹھ روپے ۸ آنے

تازہ ترین فہرست مفت طلب فرمائیں۔

ملنے کا پتہ

منیجر "مکتبہ برہان" اُردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

"تاریخی حقائق"

(از مولٰنا محمد ظفیر الدین دار العلوم معینیہ سانحہ مونگیر)

آفتاب نبوت ظاہری طور پر دُنیا سے رُوپوش ہوچکا ہے، اب سوال یہ آپڑا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ کون ہو، رُوسائے "انصار" سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں، اور بر بنائے اخلاص یہ سمجھ رہے ہیں کہ "خلافت رسول" کے سب سے زیادہ مستحق ہم لوگ ہیں، اِدھر مہاجرین بھی پہونچ چکے، یہ سمجھتے ہیں "خلیفۂ رسول" کوئی مہاجر منتخب ہو بات یہاں تک پہونچی، کہ ایک امیر انصار سے ہو اور ایک مہاجرین سے، کہ اتنے میں ایک انصاری بزرگ بشیر بن سعدؓ کھڑے ہو گئے، اور اپنی جماعت انصار کو مخاطب کر کے فرمانے لگے:-

"اے جماعت انصار! اگر ہم نے اسلام کی خدمات میں حصہ لیا تو خدا تعالےٰ کی رضا اور اس کے رسول پاک کی اطاعت کیلئے لیا، اس میں کسی پر احسان جتانے کا کیا موقع ہے؟ اور اس کے عوض متاعِ دُنیا طلب کرنا کہاں مناسب ہے؟"[1]

یہ ہے اخلاص اور حق گوئی کی ایک مثال، جو لوگ اپنی خدمت کے معاوضہ کے لئے جد وجہد کرتے ہیں، اور اپنی قومی خدمت کو دلیل بناتے ہیں، اسمبلی، کونسل اور حکومت کی کُرسی حاصل کرنے کے لئے اُن کے لئے اس واقعہ میں بڑی عبرت وبصیرت ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ متفقہ طور پر خلیفہ رسول منتخب ہو گئے، اور "خلیفۂ اسلام" کی حیثیت سے پہلا بیان دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"اے لوگو! میں تمہارا حاکم بنا دیا گیا ہوں، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر کوئی اچھا کام کروں، تو میری مدد کرو، اور اگر غلطی کروں تو اصلاح کردو۔ دیکھو سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت، تم میں جو شخص کمزور ہے وہ مرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ میں اُسے اُس کا حق نہ دلادوں انشاء اللہ، اور تم میں جو شخص قوی ہے وہ مرے نزدیک کمزور ہے جب تک کہ میں اُس سے دوسروں کا حق نہ لے لوں انشاء اللہ، دیکھو جس قوم نے بھی اللہ کے راستے میں جہاد کرنا چھوڑ دیا، اللہ نے اُسے ذلیل کردیا، اور جس قوم میں بھی بدکاری پھیل جاتی ہے، خدا اُس میں مصیبت کو پھیلا دیتا ہے، دیکھو جب تک میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں، تم بھی مری اطاعت کرو، اور جب میں خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں، تو تم بھی مری اطاعت سے آزاد ہو"۔[2]

یہ اپنی منصبی اور دینی ذمہ داری کا احساس ہے، نہ خود ستائی ہے کہ میں مُلک میں دُودھ کی نہر بہادوں گا، اور نہ تعلّی ہے کہ اب میں بہت زیادہ قابلِ احترام ہوں، ہاں غریبوں کی حمایت کا اعلان ہے، کہ وہ بھی مرے نزدیک وہی حیثیت رکھتا ہے، جو ایک بڑا مالدار۔ اور اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لئے دردمندانہ اپیل ہے، ہمارے اِس زمانہ میں جس کی کوئی وقعت نہیں، حالانکہ مُلک کی ترقی کا اِسی پر دار و مدار ہے۔

صدیق اکبرؓ "لشکرِ اُسامہ" کو اس طرح روانہ کر رہے ہیں، کہ حضرت اسامہؓ گھوڑے پر سوار ہیں اور خود خلیفہ اُن کے ساتھ پیدل چل رہے ہیں، حضرت اُسامہؓ کہتے ہیں، یہ بھلا نہیں معلوم ہوتا کہ خلیفہ پیدل ہو اور اُس کا ایک ادنیٰ سپاہی سوار۔ یہ سُنکر صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں:-

"خُدا کی قسم! دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں

[1] "تاریخ ملت" صفحہ ۳۸ جلد ۲۔

[2] "تاریخ ملت" صفحہ ۳۹ جلد ۲۔

ہو سکتی، کیا ہرج ہے، اگر میں خدا کے راستہ میں تھوڑی دُور
تک اپنا پاؤں غبار آلود کروں، جبکہ غازی کے ہر قدم کے بدلے
سات سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں[1]"

یہ ہے جذبۂ ایمان، اُن اسلاف کا قلب و دماغ کتنا روشن تھا
اور مُلاحظہ فرمائیے۔ جب جُدا ہونے لگے تو سپہ سالار کو کیسی سُنہری
اور بیش قیمت نصیحتیں فرما رہے ہیں۔ صدیق اکبرؓ خلیفہ کی حیثیت سے
ہدایات دیتے ہیں:۔

"دیکھو خیانت نہ کرنا، دھوکا نہ دینا، مال نہ چُھپانا، کسی کے
اعضاء کو نہ کاٹنا، بوڑھوں، بچّوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا،
کھجور کے درختوں کو نہ جلانا، پھل والے درختوں کو نہ کاٹنا، اور
کھانے کی ضرورت کے سوا کسی بکری، گائے یا اونٹ کو نہ
کاٹنا۔ تمہارا گذر ایک قوم پر ہوگا، جو دُنیا کو چھوڑ کر اپنی خانقاہو
میں بیٹھی ہوگی، تم اُس سے تعرض نہ کرنا[2]"

اِن نصیحتوں کو بار بار پڑھیے، اور غور کیجئے کہ ایک خلیفہ اپنی جہاد پر جانے
والی فوج کو کتنی بیش قرار ہدایت کر رہا ہے۔ انصاف سے سوچیے کیا ہمیں
وحشت و درندگی کا خاتمہ ہے، یا طوفان بدتمیزی کی اجازت، کیا آجکل
کے حکمرانوں کے لئے ان نصیحتوں میں غور و فکر اور اقتداء کی بات نہیں
اگر ہے اور یقیناً ہے تو پیروی کرنا چاہئے۔

فتنۂ ارتداد کی آگ مشتعل ہے، لوگوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے
اِنکار کر دیا ہے، صدیق اکبرؓ صحابہ کرام سے مشورہ کرتے ہیں سب
لوگ یہ رائے دیتے ہیں کہ "وقت نازک ہے، جو لوگ صرف زکوٰۃ ادا
کرنے ہی سے انکار کرتے ہیں، اُن کے ساتھ نرمی کی جائے" مگر
خلیفۂ رسول سمجھ رہے ہیں، آج کی معمولی رعایت دین کی بنیاد ہلا
ڈالے گی، اعلان فرماتے ہیں:۔

"خدا کی قسم! اگر کوئی ایک بکری کے بچہ کے دینے سے بھی جو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا جاتا تھا، اِنکار کرے گا، تو
میں اُس کے خلاف بھی جہاد کروں گا[3]"

اسے کہتے ہیں عزیمت اور دینی حمیّت و غیرت، حق کے لئے اسکی
پرواہ نہیں کی جاتی کہ کون ساتھ دیتا ہے، اور کون نہیں، اسلام
کی راہ میں رد و رعایت پسند نہیں ہے۔

اِس موقع پر اپنے سپہ سالاروں کے نام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
نے جو ہدایت نامہ جاری کیا تھا، وہ ہم سب کے پڑھنے کے لائق ہے،
فرماتے ہیں:۔

"میں مجاہدینِ اسلام کو ہدایت کرتا ہوں، کہ وہ ہر حال میں
خُدا سے ڈریں، حکم خداوندی کی تعمیل میں پوری کوشش کریں
جو لوگ حلقہ اسلام سے نکل کر شیطان کے جال میں پھنس
گئے ہیں، اُن کے ساتھ جہاد کریں، لیکن تلوار اُٹھانے سے
پہلے اُنہیں اسلام کا پیغام پہونچائیں اور اُن پر حجت پوری
کردیں، اگر وہ اسلام قبول کرلیں، تو ہاتھ روک لیں
——— امیر لشکر اپنے ساتھیوں کو جلد بازی
اور فساد سے روکے، دشمنوں کی بستی میں اندھا دھند
نہ گھسا جائے، خوب دیکھ بھال کر داخل ہونا چاہئے، ایسا نہو
کہ مسلمانوں کو نقصان پہونچ جائے، سردار فوج کوچ اور
قیام کی حالت میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ میانہ روی
اور نرمی کا برتاؤ کرے، ان کی دیکھ بھال رکھے، ان کے
ساتھ اچھی طرح پیش آئے، اور گفتگو میں نرمی اختیار کرے[4]"

اِس ہدایت میں کہیں خود غرضی، جذبات اور بے جا پاسداری کا
نام و نشان ہے، لفظ لفظ سے اخلاص و للّٰہیت عیاں ہے،
مسلمانوں اور پیغمبر اسلام پر ایمان رکھنے والوں کے لئے اس میں
بڑی عبرت و بصیرت ہے۔

۱۳ھ میں مہمات شام سامنے آئے، تو فوج کو مختلف جماعتوں
میں تقسیم کر کے مختلف اطراف میں بھیجا، اِس موقع پر بھی لشکر کو رخصت
کرنے کے لئے کچھ دور پیدل تشریف لے گئے اور رخصت کرتے
ہوئے سردارانِ لشکر کو جو بیش قیمت نصیحتیں فرمائیں،
اُن میں سے بعض سُنہری نصیحتیں یہ ہیں:۔

"(۱) ہر حال میں خُدا سے ڈرنا، وہ باطن کو بھی اسی طرح دیکھتا ہے،
جس طرح ظاہر کو۔

[1] تاریخ ملت ص۴۹ [2] ایضاً ص۵۰، [3] ایضاً ص۵۲ ج۲۔
[4] تاریخ ملت ص۵۶ ج۲۔

(۲) اپنے ماتحتوں سے اچھا سلوک کرنا، اور اُن کے ساتھ بھلا برتاؤ برتنا۔

(۳) جب انھیں نصیحت کرو، تو مختصر نصیحت کرنا، کیوں کہ جب بات لمبی ہوتی ہے، تو اس کا ایک حصّہ دوسرے کو بھلا دیتا ہے۔

(۴) پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرنا، دوسرے خود بخود اصلاح پذیر ہو جائیں گے۔

(۵) جب تمہارے پاس دشمن کے سفیر آئیں، تو اُن کی عزت کرنا۔

(۶) اپنے بھید کو چھپانا، تاکہ تمہارا انتظام درہم برہم ہو۔

(۷) ہمیشہ سچی بات کہنا تاکہ صحیح مشورہ ملے۔

(۸) رات کو اپنے ساتھیوں کی مجلس میں بیٹھنا، تاکہ تمہیں ہر قسم کی خبریں معلوم ہوں۔

(۹) لشکر میں پہرہ چوکی کا عُمدہ انتظام کرنا، کبھی کبھی اچانک پہونچکر پہرہ داروں کے کام کی نگرانی بھی کرتے رہنا۔

(۱۰) جھوٹوں کی صحبت سے بچنا، سچے اور وفادار ساتھیوں کی صحبت اختیار کرنا۔

(۱۱) جن سے ملو اخلاص سے ملنا، اور بُزدلی اور خیانت سے بچنا۔

(۱۲) تم کچھ لوگوں کو دیکھو گے، کہ دُنیا سے بے تعلق اپنی عبادت گاہوں میں بیٹھے ہیں، اُن سے ہرگز نہ اُلجھنا، اور انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دینا۔ لہ"

"خلیفۂ اسلام" کی اس ہدایت کو غور و فکر کی نظر سے ملاحظہ فرمایئے انسانی اور خداوندی قانون میں جو فرق ہو سکتا ہے وہی فرق آپ کو اس "ہدایت نامہ" اور آجکل کے موجودہ وزراء کی ہدایتوں میں نظر آئے گا، اللہ کا خوف ہمارے اسلاف پر کتنا غالب ہے، یہ نہیں فرماتے کہ قانون کی خلاف ورزی تمہاری دُنیاوی ہی زندگی کے لئے مضر ہو گی بلکہ زیادہ حوالہ خدا اور آخرت کا ہے، ظاہر کے ساتھ باطن کی اصلاح کا بھی حکم ہے، دوسروں کے عیب سے زیادہ اپنے عیوب پر نظر رکھنے کی تاکید ہے، کاش آج کا گمراہ انسان اِن باریکیوں کو یقین کے ساتھ سمجھ لے، اور عمل پیرا ہو جائے۔

ارباب حکومت اور سپہ سالاران فوج کے لئے اِن نصیحتوں اور ہدایتوں میں بڑا بیش قیمت سبق ہے وہ ان کو پڑھیں اور اپنے نیچے والوں کو سُنائیں۔

شام کی مہمات کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تین چار جماعتیں الگ الگ سپہ سالار کی قیادت میں روانہ ہوئی تھیں، رومی فوج ہر ایک کے مقابلہ میں کئی کئی گنی زیادہ روانہ ہوئی، مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ڈھائی لاکھ رومی فوج چار مختلف حصّوں میں بٹ کر آرہی ہے، اگر ہم نے الگ الگ مقابلہ کیا تو پیس ڈالے جائیں گے۔ حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے رائے دی کہ ہم سب یکجا ہو کر مقابلہ کریں، تو انشاءاللہ تعداد کی قلت مضر نہ ہو گی سب نے آپ کی اِس رائے کو پسند کر لیا، چنانچہ دربارِ خلافت سے اِس کے لئے اجازت طلب کی گئی، حضرت صدیق اکبر رضؓ نے اجازت مرحمت فرمادی، مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا:-

" مسلمان تعداد کی کمی کے سبب کبھی مغلوب نہیں ہو سکتے، البتہ اگر وہ گناہوں میں گھر گئے تو مغلوب ہو جائیں گے لہذا انہیں گناہوں سے بچنا چاہیے۔" لہ

ایمان اور پختگی اسے کہتے ہیں، بھارت کے مسلمان جو خوف و ہراس سے مرتے جا رہے ہیں، اسے بار بار پڑھیں، اور خوب غور کریں کہ کیا بات یونہی نہیں ہے، عہد نبویؐ اور خلفائے راشدین کے عہد خلافت میں جو لڑائیاں پیش آئی ہیں، اُن کا مُطالعہ کیا جائے، تاریخوں سے پوچھا جائے کہ مسلمان کبھی قلت تعداد سے گھبرائے، خدا کی قسم! اگر آج بھی مسلمان گناہوں سے ہاتھ اُٹھالیں تو دُنیا کی ساری طاقت مل ملا کر بھی ایک مسلمان کا بال بیکا نہیں کر سکتی، موجودہ دور میں بھی اُن خدا ترس بزرگوں کو دیکھیے، جو گناہوں سے الگ تھلگ ہیں کہ کیسی باعزت زندگی گذار رہے ہیں۔

ممالک اسلامیہ کے ارباب حکومت اور دوسرے افرادِ اُمت

لہ تاریخ ملت ص۲۰۰ ج ۲ و ص۱۴۲ ج ۲

لہ تاریخ ملت ص۱۰۰ ج ۲

کے لئے بھی اس "نامۂ صدیقی" میں بڑی عبرت و بصیرت ہے۔

جو دوسروں کے سہارے زندگی کے دن گذار رہے ہیں، وہ لرزہ براندام ہیں کہ اگر فلاں حکومت مجھ سے خفا ہوگئی، تو خیر نہیں، کیا یہ سارے حالات اعمال و اخلاق کی پیداوار نہیں ہیں؟ کاش مسلمان سوچتے کہ کیا تھے، اور گناہوں نے اُن کو کتنا پامال کر دیا۔

صدیق اکبرؓ کی مدّت خلافت کُل دو سال تین مہینے اور دس دن ہے، مگر اس قلیل عرصہ میں آپ نے جو کارنامے انجام دئے اس کی گواہی تاریخ کے پارینہ اوراق دیں گے، ۱۳ جمادی الآخری ۱۳ھ کو جب آپ بخار میں مبتلا ہوئے اور آپ کو اپنی وفات قریب نظر آنے لگی، تو آپ نے یہ وصیّت فرمائی:-

"میری زمین فروخت کر کے وہ روپیہ ادا کر دیا جائے، جو میں نے وظیفۂ خلافت کی صورت میں وصول کیا ہے[۱]"

دیکھ رہے ہیں خلیفۂ اسلام کی خشیت الٰہی کا نقشہ، بیت المال کی جو رقم صحابہ کرام کے مشورہ سے لینا قبول کیا تھا، اُسے بھی آخری وقت میں ادا کر دینے کی تاکید فرما رہے ہیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل بھی کی گئی، اور بیت المال کی کُل رقم آپ کی جائداد سے ادا کر دی گئی۔

حالانکہ یہ وہ بزرگ ہیں جن کی دولت "اسلام" کے نام پر نچھاور تھی، جو خلافت سے پہلے کامیاب کاروبار کے مالک تھے، اور "دربارِ خلافت" ہی کی وجہ سے صحابہؓ نے آپ کو مجبور کیا تھا کہ کاروبار چھوڑیئے، بیت المال سے اپنی ضروریات زندگی پوری کیجئے۔

کیا اس "وصیّت صدیقی" میں اُن اربابِ حکومت کیلئے کوئی سبق نہیں، جو دس دس ہزار ماہانہ حکومت کے خزانہ سے وصول کرتے ہیں اور پھر پبلک پر احسان جتاتے ہیں، جن حکّام اور افسروں نے حکومت کے خزانہ کو اپنی موروثی جائداد سمجھ رکھا ہے۔

اپنی وفات سے قریب صدیق اکبرؓ نے کفن کے متعلق وصیّت کرتے ہوئے فرمایا:-

"جو کپڑا اس وقت میرے بدن پر ہے، اسی کو دھو کر اس میں کفنا دینا۔"

اِس پر حضرت عائشہ صدیقہؓ آپ کی پیاری بیٹی نے کہا بھی "ابا جان! یہ تو پرانا ہے" یہ سُنکر آپ نے جواب دیا:-

"میرے لئے یہی پھٹا پرانا کافی ہے۔"

اللہ اکبر! یہ ہے عجز و انکساری، جس نے اپنی زندگی میں لاکھوں روپئے اسلام کی اشاعت اور تبلیغ دین میں خرچ کئے، بیسیوں غلاموں، لونڈیوں کو آزاد کیا، اور بھاری بھاری رقم میں خرید خرید کر آزاد کیا، سینکڑوں یتیموں اور بے کسوں کی امداد کی، وہ اخیر وقت میں یہ بھی نہیں پسند کرتا کہ اس کے کفن میں نیا کپڑا دیا جائے۔

آپ کی یہی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ خدا کے نبیوں اور رسولوں کے بعد انسانی جماعت میں سب سے برگزیدہ آپ ہی ہیں۔

انہی حضرت صدیق اکبرؓ کا واقعہ ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر جان نثاروں پر بجلی بنکر گری، اور بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام کے ہوش و حواس جاتے رہے، اس وقت آپ نے یہ تقریر فرمائی:-

"جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتے تھے، انھیں معلوم ہونا چاہئے، کہ آپ کا تو وصال ہو گیا، لیکن جو لوگ خدا کی عبادت کرتے تھے، انھیں معلوم ہونا چاہئے، کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور وہ کبھی نہ مرے گا[۲]"

اس کے بعد وہ آیت پڑھی جس میں رب العزت نے یہ خبر دی تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسول ہی تو ہیں، جن سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں، تو کیا خدانخواستہ یہ رسول وفات پا جائیں گے، یا شہید ہو جائیں گے تو تم دین سے پھر جاؤ گے؟

اِس تقریر کا صحابہ کرام پر بہت ہی اچھا اثر ہوا، اور آنکھوں کے سامنے سے وہ پردہ اُٹھ گیا، جو غم اور افسوس نے ڈال دیا تھا۔

اِس تقریر پر غور کیجئے ایمان کتنا مضبوط اور ٹھوس ہے، عاشق نبی ہیں اُن کی ایک ایک ادا پر جان دیتے ہیں، مگر جب دین کی بات آگئی تو کتنی برجستہ اور برموقت تقریر فرمائی۔

۱؎ تاریخ صد ۹۲-۱۶

۲؎ تاریخ امت ص ۲۷ ج ۲

شروع اسلام کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کافروں کے مظالم سے مجبور ہو گئے اور ہجرتِ حبشہ کا ارادہ فرمالیا، ابن الدغنہ جو کافر تھا، اُس سے ملاقات ہوگئی، وہ کہہ سُنکر لوٹا لایا، اور اپنی پناہ کا اعلان کرا دیا، مگر یہ پابندی عائد کرنی چاہی، کہ قرآن کی تلاوت جہری نہ فرمائیں، یہ سُنکر آپ نے صاف فرما دیا:-

"مجھے تمہاری پناہ کی ضرورت نہیں ہے، میرے لئے اللہ کی پناہ کافی ہے۔"[1]

خُدا پر ہمارے اسلاف کو کتنا اعتماد اور بھروسہ تھا، اللہ اکبر! کہیں اُن میں ذرہ برابر جُنبش اور کمزوری کا اس سلسلہ میں پتہ نہیں چلتا، کاش یہ کھوئی ہوئی دولت پھر ہمیں میسّر آجائے۔

دین سے شیفتگی کا ایک واقعہ اور سُننے کے لائق ہے اور سوچنا ہے کہ خلیفۂ رسول کو دین کی عزت کتنی محبوب تھی،:-

عراق میں ایک مقام "حیرہ" ہے ضرورت آپڑی تو یہاں سے حضرت خالدؓ کو شام کی طرف بھیجدیا گیا، یہاں اُن کا قائم مقام حضرت مثنّٰی بن حارثہؓ قرار پائے، حضرت مثنیٰ کے پاس صرف آدھی فوج رہ گئی تھی ایرانیوں نے حملہ کر دیا، مگر مقابلہ کیا، اور کامیاب بھی رہے، لیکن ایرانی چین سے نہیں بیٹھے بلکہ ایک بڑی جمعیت کے ساتھ مُسلمانوں پر حملہ کی تیاری شروع ہو گئی، حضرت مثنّٰیؓ نے مناسب سمجھا کہ دربارِ خلافت کو اطلاع کر دیجائے، اپنا ایک قائم مقام بنا کر خود چل دئے، جس دن یہ مدینہ پہونچے صدیق اکبرؓ کی زندگی کا آخری دن تھا، پھر بھی حضرت مثنّٰیؓ کو بُلوا کر ان سے کُل حالات سُنے، اور اُسی وقت حضرت عمرؓ کو بُلا بھیجا اور جب وہ تشریف لے آئے تو آپ نے فرمایا:-

"اے عمر! مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اب دُنیا سے رخصت ہو رہا ہوں، اگر میں مرجاؤں، تو تمہارا پہلا کام یہ ہے کہ مثنّٰی بن حارثہؓ کی امداد کے لئے مدینہ سے فوج روانہ کرو، دیکھو اس کام میں دیر نہ کرنا، یہ دین کی عزت و حرمت کا معاملہ ہے۔"

[1] تاریخ ملت ص۲۴۴ ج ۲-

یہ سوز و گداز دیکھتے ہیں، سب دین کے لئے ہے، خُدا کیلئے ہے، اور اس کے دین کی بلندی اور اشاعت کے لئے ہے، موت کو لبیک کہہ رہے ہیں، جتنا موقع بھی مل رہا ہے، وہ اسلام کی اشاعت کی فکر میں گذار رہے ہیں، دُنیا کی کوئی بات سامنے نہیں ہے، کاش مسلمانوں کی سوئی ہوئی بستی جاگے، اور احساس کرے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، ہمارا جینا مرنا، کھانا پینا اور چلنا پھرنا کس کے لئے ہونا چاہیے ؎

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

زندگی نے وفا کی تو بقیہ حصے دوسرے مہینے میں پیش کئے جائیں گے +

اسلامی عُلوم کا ایک شاندار تذکرہ

"تاریخ دیوبند"

دیوبند اور دار العلوم دیوبند کی نہایت محققانہ تاریخ ہے، اپنے موضوع پر یہ پہلی اور مہتم بالشان تصنیف ہے جس میں "دار العلوم دیوبند" کی علمی تاریخ اور اُس کے نصب العین کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے، قدیم تعلیمی نظام کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے قیمت مجلّد معہ دیدہ زیب سرورق ۲؍، دو روپئے۔

"دار العلوم دیوبند ایک نظر میں" دار العلوم کی شاندار عمارتوں کا نہایت دلکش قلمی مرقع ہے۔ قیمت چھ آنے ۶؍

"دار العلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات" دار العلوم کی وہ تعلیمی خصوصیات جنہوں نے دُنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں اُسے ممتاز بنا دیا ہے۔ قیمت چھ آنے ۶؍ ملنے کے پتے:-

ہندوستان میں:- "ادارہ تاریخ دیوبند" دیوبند یو، پی"

پاکستان میں:- "حضرت مولٰنا مفتی محمد شفیع صاحب میونسپل ہسپتال کیمبل روڈ، کراچی"

دوسری قسط:-

ایضاح الحق الصّریح

مسئلہ احتیاط الظہر!

ایک تحقیقی بحث ــــــ اور ــــــ ایک فقہی مسئلہ

علامہ کمال الدین ابن ہمام شارح ہدایہ کامل صوفی عارف باللہ حنفی مشہور "فتح القدیر" ہی میں فرماتے ہیں:-

"آپ پر خاص ایک مجتہد معین کے قول اور فعل کو لازم کرنے سے اس کی تقلید لازم ہونے پر کوئی بھی تو دلیل نہیں بلکہ دلیل کا مقتضا تو یہ ہے کہ خواہ کوئی سا مجتہد ہو جب حاجت پڑے اُس کے قول پر عمل کرلے"

صراطِ مستقیم میں ایک طویل عبارت میں تقریباً وہی مضمون ایضاح والا درج فرمایا ہے، فرماتے ہیں:-

"پس اس قدسی فیض کی تکمیل جو غیب الغیب سے نازل ہوا ہے دو وجہ سے ہوسکتی ہے اول آنکہ جن امور کو معاش اور معاد کی اصلاح میں تاثیر ہے اور نجات اور درجوں کے بلند کرنے میں دخل ہے اُن ہی امور کے سیکھنے کو اپنی ہمت کا قبلہ بنا کر قرآن اور حدیث کی طرف متوجہ ہوجائے اور مذکورہ عقائد کی تصدیق اور ماثورہ احکام کی تعمیل اور پسندیدہ اخلاق کی تحصیل اور سیاسیات اور معاملات مقصودہ کے قائم کرنے میں نہایت کوشش کرے اور کتاب و سنت سے شارع کا مقصود اور سعادت کی بنیاد یہی ہے اور شارع علیہ السلام نے واضح بیان کے ساتھ اسی کی تفصیل فرمائی ہے، اور اسی کے مبادی حاصل کرنے کے طریقوں کو کمال قصد سے منضبط کیا ہے"۔

دوم آنکہ اللہ تعالٰی کے کلام کی بلاغت کے طریقوں اور عقائد حقہ کی دلیلوں اور احکام منصوصہ کی حکمتوں اور اخلاق محمودہ کے پیدا ہونے کی وجہوں اور معاملات اور قوانین حدیثیہ کے لفظوں پر واقفیت کو اپنے دھیان میں رکھکر اور اپنے ارادے کا قبلہ بنا کر قرآن مجید اور حدیث شریف میں غور کرے اور اس طرح سے غور کرنا شارع علیہ السلام کا بالذات مقصود نہیں اسی واسطے اس کی تصریح نہیں فرمائی اور اس کے حاصل کرنے کے مبادی اور اس کے حاصل کرنے کے طریقوں کو بیان نہیں فرمایا مثلاً قواعد علوم صرف و نحو و معانی و بدیع وغیرہ فنون عربیہ کی تفصیل اور منطق اور فلسفہ اور مناظرہ کے استدلالیہ مسائل کی بنیاد اور قوانین اجتہادیہ کے مباحث، قیاس اور تعیین علل اور مسائل ترجیح اور قواعد جدل اور انسان کی باطنی قوتوں کی تشریح اور حکمت عملیہ کے اصول کی تنقیح کے بارے میں شارع ؑ سے کچھ بھی منقول نہیں بلکہ جو کچھ جناب ؐ سے منقول ہے وہ فقط قرآن و حدیث ہے اور حجت اور دلیل اور تلوار اور نیزے کے ساتھ آپ کی دعوت ان ہی دو چیزوں کی طرف تھی اور ان دونوں چیزوں کی اشاعت میں آپ نے کس قدر تکلیفیں اور مشقتیں اُٹھائی ہیں۔ ہاں! علم قرآن مجید اور حدیث شریف کی تحصیل کے بعد یہ نازک اور باریک علم بعض لوگوں کے واسطے اکسیرِ اعظم کا حکم رکھتے ہیں کہ ان کے نفسوں کو امارت اور وراثت نبوت کا منصب بخشتے ہیں، اور اسی واسطے جب یہ قرآنِ عظیم اور حدیث نبی کریم حدِ تواتر اور شہرت کو

پہنچ گئے اور ہر خاص اور عام نے اپنے اپنے حصے کے موافق کامیابی حاصل کرلی اور ان دونوں کی تسلیم نے تمام اہلِ اسلام کے دلوں میں اولیات کی تسلیم کا رنگ پکڑ لیا تو فنون عربیہ کے استادوں اور اجتہاد کے اماموں اور علم کلام کے داناؤں اور تہذیب اخلاق اور حکمت ایمانیہ والوں کی کوشش سے وہ باریک علوم ظاہر ہوئے اور ان بزرگوں کو اسی کوشش کی وجہ سے (علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل) کے زمرہ میں جگہ ملی ہے اور ان کے پیروان بحثوں کی تطویل میں نیک کوشش بجا لائے کہ اتنے لمبے چوڑے باریک علوم پیدا ہو گئے۔ اور ان بزرگوں کے اس برکت والے زمانے کے گذرنے کے بعد بے معنیٰ مقلدوں کی ایسی جماعت پیدا ہوئی جس میں حبّ جاہ اور طلب ریاست طبعی طور پر بھری ہوئی تھی بس انہوں نے اسی گفتگو اور جھگڑے کو بزرگی اور کمال سمجھ کر قرآن مجید اور حدیث شریف کو پس پشت ڈال کر اپنی تمام عمر کو ایسے ہی فضول اُمور کے حاصل کرنے میں ضائع کر دیا۔ صـ۴۷ صراطِ مستقیم ترجمہ اُردو۔

صـ۳۶ ایضاح میں ازانجملہ تعیین آثار و ثمرات سے لیکر دور تک جو مضمون بیان فرماتے چلے گئے ہیں اگر بنظرِ امعان ملاحظہ کیا جائے تو کوئی اعتراض بفضلہ تعالےٰ باقی نہیں رہتا۔ بابِ تحدیدات و بابِ حفظِ مراتب امور ملت ہی پر زور دیا ہے۔

بدعت حقیقیہ اور وصفیہ کے بیان کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مخفی نماند کہ از ملاحظہ تعریف ہر دو قسم بدعت چناں ظاہر ے گردد کہ اصل مدار مطلق بدعت بر عقیدہ است۔" صـ۴۶،

مسئلہ ثالثہ میں فرماتے ہیں:۔

"تعیین اوراد و اذکار و ریاضات و خلوات و اربعینات و نوافل عبادات و تعیین او ضاع اذکار از جہر و اخفاء و ضربات و اعداد و مراقبات برزخیہ و التزام طاعات شاقہ ہمہ از قبیل بدعات حقیقیہ است بہ نسبت اکثر طلاب کہ آں را اصل کمال شرعی یا از مکملات آں می دانند اما بہ نسبت خواص کہ آں را محض از قبیل وسائل دانستہ در تعلیم و ترویج آں سعی می کنند پس از قبیل بدعات حکمیہ باشد آرے اخص الخواص کہ محض بنا بر ہدایت چندے از اغبیاء کہ نفوس ایشاں در مرتبۂ قصورے از غباوت یا عصیاں واقع شدہ اند اگر تعلیم امور مذکورہ کردہ باشند الخ بہ نسبت ایشاں از قبیل بدعات نباشد اما کلام دریں مقام در اکثر اہل زمان است کہ آں را شریعت مستمرہ و طریقۂ سلوکہ می شناسند"

اِس عبارت طویلہ کو بغور ملاحظہ فرما لینے سے آپ کو کوئی خلجان، مسئلہ خامسہ کی عبارت میں نہیں رہ سکتا متکلم کی مراد یہ قطعاً نہیں جو جناب سمجھے ہیں فرق مراتب نہ کرنے سے جو قباحتیں پیدا ہو گئی ہیں وہ بھی جناب سے مخفی نہیں پھر مطلقاً قیاس کی نفی نہیں فرمائی، بلکہ اسی فصل کے آخر میں واضح فرما دیا ہے کہ:۔

"کہ اکثر قدماء کہ قیاس را تقبیح کردہ اند از لفظ قیاس ہمیں معنی مذکور مراد داشتہ اند نہ قیاس شرعی، کہ حمل النظیر علی النظیر است۔"

صراطِ مستقیم میں بدعات کی تردید سے متعلق جو ارشادات فرمائے ہیں ان کے دیکھنے کے بعد ایضاح کی کسی عبارت پر اعتراض باقی نہیں رہتا۔ فرماتے ہیں:۔

"القصہ اگرچہ صاف باطن لوگوں کو اولیاء اللہ کی قبروں کی طرف سفر کرنے سے کسی قدر فائدہ ہوتا ہے مگر عام مومنوں کو اس سے اس قدر بھاری نقصان پہنچا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ پس سب خواص و عوام کو چاہئے کہ ضرور اس امر سے اعراض کر کے اس کو بالکل بھلا دیں" صـ۵۶ ترجمہ اُردو صراطِ مستقیم۔

پھر صفحہ ۵۴ پر اولیاء اللہ کی نذر و نیاز کے متعلق فرماتے ہیں:

"کہ یہ اُن بدعات میں سے ہے جو اہلِ اسلام کے خاص و عام بلکہ اکثروں میں نہایت درجہ مشہور ہو چکی ہیں اسکی

اصل اگرچہ بہت عمدہ اور حکم شرع کے موافق ہے لیکن جب عوام نے اپنے ظنوں اور وہموں کو اس میں دخل دیا اور اُن کی اولاد اپنے سلف کے تابع ہوگئی اور ان امور کی تجدید و تحدید کی ہر کہ آمد براں مزیدے کرد' والے قاعدے کو دستور العمل ٹھیرایا تو وہ پسندیدہ اصل تو مفقود ہوگیا الخ"۔

"اور ان امور میں جو چیز لازم نہیں اُس کو لازم جاننا شیطانی فریب اور اللہ کی مرضیات سے بعید ہے نماز کے بعد داہنے طرف سے پھرنے کے التزام کا ممنوع ہونا اس بیان کا گواہ ہے پس اس قدر سہل کام کا التزام کہ نماز سے فارغ ہوکر داہنے طرف سے پھرنا چاہیئے شیطان کا حصہ ہوگیا تو دوسرے عمدہ کام (جو ضروری ہوں) کے التزام کا نام "نصیب شیطان" سے بھی زیادہ بُرا ہونا چاہیئے۔

ترجمہ اُردو صراط مستقیم۔

ص۶۰ "پس اگر کوئی شخص پیغمبر خُدا صلے اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے واسطے شب برات کو صلحاء کا مجمع کر کے کسی مقبرے میں بہت ساری دعائیں کرے تو آنجناب کے عمل کے خلاف ہونے کے باعث اسے ملامت نہیں کر سکتے لیکن اس قدر سمجھنا چاہیئے کہ یہ امر ہوتے ہوتے رسم بنجائے گا اور اس میں حقیقت کا نام باقی نہ رہے گی اس بیان کو واضح کرنے والی مثال فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ نوافل جماعت سے مکروہ نہیں اور اگر تداعی سے ہو تو مکروہ ہے"۔

ص۶۲ ترجمہ اُردو صراط' میں فرماتے ہیں :۔

"اور حدیث شریف میں جو تاکید سُنتوں کو فرضوں سے جُدا کرنے کے بارے میں کی جاتی ہے یاد کر کے اس کو عمل میں لانا چاہیئے"۔

ص۱۲۸ ترجمہ اُردو' فرماتے ہیں :۔

"اشغال مبتدعہ میں سے شغل برزخ بھی ہے جو اکثر متأخرین میں مشہور ہوگیا ہے بلکہ بزرگوں کے کلام سے بھی پایا جاتا ہے الخ"۔

کچھ سطور تک تفصیل فرمانے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں آپؒ کی متابعت کرنے والوں کو بھی چاہیئے کہ اسی احتیاط کے طریقے کو اختیار کر کے شغلِ برزخ کو حرام اور بُرا جانیں۔

ص۹۱ نامعقول سالکوں میں اس مانع کے ڈھونڈنے کی علامت یہ ہے کہ وہ مشائخ کے بتلائے ہوئے اوراد میں جو اہتمام کرتے ہیں' نماز کے ادا کرنے میں اس اہتمام کا عشر عشیر بھی نہیں کرتے بلکہ ملعون شیطان اس جماعت پر قابو پالیتا ہے تو بمقتضائے آیتہ' "وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ الآیۃ اُن کو راہِ حق سے بہت دُور لیجاتا ہے نماز کو سرکاری بیگار کی مانند جانتے ہیں'

الحاصل ان عبارات کے پیش کرنے سے غرض یہ ہے کہ قدرِ مشترک یہی مضمون حضرت شاہ اسمٰعیلؒ کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ عبقات میں بھی اسی قسم کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ پھر محض اتنی سی بات سے کسی کتاب کو اُن کی تصانیف سے باہر نہیں نکالا جاسکتا۔

پھر اور امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہر تصنیف کے شروع میں شاہ صاحبؒ نے اپنا نام درج فرمادیا ہے چنانچہ ایضاح الحق الصریح' کے شروع میں فرماتے ہیں :۔

"از بندہ ضعیف الراجی رحمۃ اللہ الجلیل احقر العباد محمد اسمٰعیل عفی عنہ استفسار این معنی فرمودہ یعنی مولٰنا تفضل علی صاحب مرحوم نے آپ سے اس کتاب کے لکھنے کے متعلق فرمایا"۔

صراطِ مستقیم کے شروع میں بھی یہی الفاظ ہیں :۔

"امّا بعد عاجز ذلیل اُمیدوار رحمت ربّ جلیل بندہ ضعیف محمد اسمٰعیل عرض کرتا ہے" (ترجمہ اُردو صراط)

منصبِ امامت کے شروع میں ہے :۔

"اما بعد می گوید بندہ ضعیف الراجی رحمۃ اللہ الجلیل احقر العباد محمد اسمٰعیل عفا اللہ عنہ"۔

دوم یہ عرض ہے کہ نصرت المقلدینؒ تصنیف مولٰنا احمد علی بٹالوی مقیم دہلی غیر مقلدین کے رد میں لکھی گئی جو ۱۳۰۳ھ میں تکمیل کو پہونچی مصنف نے حضرت مولٰنا کرامت علی صاحب مرحوم کا زمانہ خوب پایا ہے

اور ۱۳۲۰ھ میں طبع ہوئی اس پر علماء مکہ مکرمہ، دہلی، کان پور، دیوبند، گنگوہ شریف، مراد آباد، مدراس، لاہور، پشاور، بہار، یوپی، وغیرہ کے دستخط تقاریظ و تصدیقات ثبت ہیں، مولانا احمد علی صاحبؒ نے جابجا ایضاح الحق الصریح کو شاہ صاحب شہید کی تصنیف فرمایا ہے اور اس کے حوالجات دیئے ہیں۔ چنانچہ ص۱۳۶ پر فرماتے ہیں:

"اور مولوی اسمٰعیل صاحبؒ دہلوی لکھ چکے ہیں کہ احکام مستنبط مجتہدین حرام و حلال وغیرہ سنت حکمیہ میں داخل ہیں، ہرگز محدث و بدعت نہیں۔"

یہ ایضاح الحق کی اسی عبارت کا ترجمہ ہے جو قبل ازیں ہم نے درج کی ہے۔ ص۸ پر فرماتے ہیں:۔

"مولوی صاحبؒ جو پہلے ایضاح الحق میں لکھ چکے ہیں"

ص۶۴ پر فرماتے ہیں مولوی صاحب (محمد اسمٰعیل شہید دہلویؒ)، اپنے رسالہ ایضاح الحق الصریح میں فرماتے ہیں:۔

"مسائل مستنبط مجتہدین سابقین خواہ بایں وجہ باشد کہ فلاں امر واجب است یا مندوب یا مباح یا مکروہ یا حرام الخ ہمہ از قبیل سنت حکمیہ است ہرگز در قسمی از اقسام بدعت نیست۔"

اس پر کئی سو علماء کی تصدیقات و تقاریظ ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ مولانا عبد الحق حقانیؒ، مولانا عبد العلی آسی مدراسی، مولانا عبد العلی محدث دہلویؒ۔ حضرت شیخ الہند محمود الحسن صاحبؒ حضرت مولانا محمد علی کانپوریؒ (مونگیری) مولانا آسی مدراسی نے تو طویل نظم میں تقریظ لکھی ہے، مولانا شیخ المشائخ سید احمد کردوی ثم مکی نے فارسی نظم میں تقریظ لکھ کر تاریخ تصنیف "ردِّ لامذہباں" ۱۳۰۰ھ مبارکباد لکھا ہے، مولانا اصغر علی روحی (جو علامہ فیض الحسن ادیب کے تلمیذ ہیں) نے بھی تقریظ لکھی ہے۔ مفتی مسیح الزماں مسیح الدین خاں۔ بعض علماء مہروں پر ۱۲۷۶ھ ۱۲۷۹ھ درج ہے جو خود مولانا کرامت علی مرحوم کے ہم زمانہ بلکہ شاہ صاحب مرحوم کے ہم زمانہ تھے۔ حضرت مولانا عبد الاول جونپوری خلف الصدق مولانا کرامت علی صاحب مرحوم کی بھی تقریظ ہے، فرماتے ہیں:۔

"وبعد فقد سرحت نظری فی ریاض ھذا الکتاب الغنی بشہرتہ عن المدح والاطناب فوجدت المؤلف المولی الجلیل الحری بالاکرام والتبجیل سالکاً مسلک المحققین اولی الالباب فجزاہ اللہ خیر الجزاء انہ الملک الوھاب العبد الارذل عبد الاول عفا عنہ اللہ الاجل"

مہر کے الفاظ یہ ہیں "عبد الاول بن علی جونپوری ۱۳۰۰ھ" مولانا قاضی خلیل الدین پیلی بھیت، محمد فضل الرحمٰن قاضی مراد آباد، حافظ محمد اکرم قاضی کیمپ مئو، مولانا ارشاد حسین رام پوری، مولانا اعجاز حسین صاحب سجادہ نشین خانقاہ شاہ غلام علی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب دیوبندی، مہر پر ۱۳۰۰ھ درج ہے، خادم العلماء محمد لدھیانوی ۱۳۰۰ھ، حضرت مولانا منصور علی امام مسجد حسن مہر پر ۱۲۷۳ھ ثبت ہے۔ لہٰذا حضرت شیخ المحدثین زبدۃ المحققین، شیخ الاسلام والمسلمین استاذی سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہم کا ایضاح کی توصیف فرمانا حقیقت پر مبنی ہے فرمایا کرتے تھے "حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیلؒ نہایت ذکی تھے تقویۃ الایمان سے الطف اُن کی کتاب "ایضاح الحق الصریح" ہے"۔

بہر حال یہ اساتذہ کے تواتر سے ثابت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ والسلام

مسئلہ احتیاط الظہر

امر دوم کے متعلق عرض ہے، کہ احتیاط الظہر کے خلاف فتویٰ دینے میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ متفرد نہیں، حضرت کا فتویٰ مطبوعہ ہر جگہ مل سکتا ہے اس پر حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحب برادر حضرت شیخ الہندؒ اور خود حضرت شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمد امیر الدین واعظ جامع مسجد دہلی، مولانا محمد حسین فقیر دہلوی، مولانا محمد طاہر سلہٹی، مولانا ثابت علی اعظم گڑھ، مولانا عبد الحق دہلوی مصنف تفسیر حقانی وغیرہم کے دستخط ثبت ہیں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر جو مصدق اس فتویٰ کی ہے ساتھ ہی مطبوعہ بھی ہے، بہشتی گوہر میں بھی حضرت تھانویؒ کی

تحریر موجود ہے۔ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن مفتی اعظمؒ۔ مولانا منفعت علی مدرس دیوبند۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور علماء سہارنپور مدرسہ مظاہر العلوم کے، اور اس کے متعلق مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا مطبوعہ فتویٰ بھی ہے جس کی تائید حضرت گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مفتی صاحب دیوبندی حضرت مولانا احمد حسن صاحب کانپوری مرحوم، مولانا محمد فاروق مرحوم مدرس اول، ندوۃ العلماء و مولانا عبد اللطیف رحمانی مدرس ندوۃ العلما و مفتی، اور ایک مستقل فتویٰ جامع الآثار کے آخر میں صفحہ ۱۵ پر حضرت علامہ محدث شوق نیموی رہ کا بھی ہے یہ جمیع حضرات احتیاط الظہر کے خلاف ہیں اور ان کے فتاویٰ کا مدار کتب فقہ حنفی پر ہے، کتاب علم الہدیٰ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

کنز الدقائق مجتبائی کے متن میں ہے وَتُؤدّى فِي مِصْرٍ فِي مَوَاضِعَ۔ "جمعہ ایک شہر میں متعدد مقامات میں ادا ہو جاتا ہے۔"

اور اس کے حواشی میں ہے کہ سید حموی شارح اشباہ والنظائر سے سوال کیا گیا چار رکعت بعد جمعہ بنیت ظہر ادا کرنا کیا فرض ہے واجب ہے سنت ہے مستحب ہے؟ یا ان میں سے کچھ بھی نہیں تو سید حمویؒ نے جواب میں فرمایا، نہ یہ چار رکعت فرض ہیں نہ واجب نہ سنت، بلکہ مذہب میں اس کی کوئی اصل نہیں الخ۔ در المختار میں فرماتے ہیں :۔

كل ذالك خلاف المذهب فلا يُعوَّل عليه كما حرره في البحر۔

"یہ سب کچھ مذہب حنفی کے خلاف ہے اس پر مطلقاً اعتماد نہ کیا جائے۔"

بحر الرائق میں فرماتے ہیں :۔

اقول وقد كثر ذالك من جهلة زماننا ايضاً ومنشأ جهلهم صلوٰة الاربع بعد الجمعة بنية الظهر وانّما وضعها بعض المتأخرين عند الشك في صحة الجمعة بسَبَبِ رِوَايَةِ عَدَمِ تَعَدُّدِهَا فِي مِصْرٍ وَاحِدٍ وليست هذه الرواية بالمختارة وليس هذا القول اعنى اختيار صلاة الاربع بعدها مرويا عن ابى حنيفةؒ و صاحبيه حتى وقع لى انى افتيت مراراً بعدم صلوٰتها۔

"میں کہتا ہوں ہمارے زمانہ میں جاہل اکثر ایسا کرتے ہیں اور انکی جہالت کا منشا جمعہ کے بعد چار رکعت بہ نیت ظہر پڑھنا ہے اس کو تو بعض متاخرین نے جمعہ کی صحت میں شک ہونے کے وقت وضع کیا ہے حالانکہ یہ روایت مختارہ نہیں ہے کہ جمعہ ایک شہر میں متعدد مقامات میں جائز نہ ہو اور یہ احتیاط الظہر امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، اور صاحبین سے مروی نہیں ہے حتیٰ کہ میں نے اس احتیاط الظہر کے نہ پڑھنے کا بارہا فتویٰ دیا ہے۔"

آگے فرماتے ہیں :۔

ومبنى هذه على القول الضعيف المخالف للمذهب فليس الاحتياط فى فعلها الخ

"یعنی اس احتیاط الظہر کی بناء ضعیف قول پر ہے جو مخالف مذہب حنفیہ ہو۔ پس اس احتیاط الظہر کے ادا کرنے میں احتیاط نہیں۔"

فكان الاحتياط فى تركها۔

"سو اس کے تو نہ کرنے میں احتیاط ہے۔"

امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ امام [illegible] بن زیادؒ ابو مطیع بلخیؒ امام طحاویؒ و دیگر ائمہ احناف سے کہیں بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ دیہات میں جمعہ پڑھو [illegible] پڑھو۔ حنفیہ فرماتے ہیں :۔ امصار (مدائن) میں جمعہ فرض ہے، سو وہاں بھی ظہر ذمہ سے ساقط ہوئی اور دیہات میں جمعہ ناجائز۔ قدوری وغیرہ میں ہے :۔ ولا تجوز فى القرىٰ۔

قاضی ثناء اللہ صاحبؒ پانی پتی مالا بد منہ میں فرماتے ہیں "نزد امام اعظمؒ در دیہات جمعہ جائز نیست"

حضرت مولانا کرامت علی مرحوم فرماتے ہیں :۔

"گنویں (گاؤں) کے لوگ اور جنگلی لوگ جن پر جمعہ واجب نہیں ہے، جمعہ کے روز ظہر جماعت کے ساتھ پڑھیں، اذان اور اقامت کے ساتھ۔"

یہ مضمون شرح اوراد کا ہے مفتاح الجنۃ صے "احتیاط الظہر دیہات میں بھی ثابت نہ ہوئی یہ تو کسی فقیہ امام حنفی کا مذہب نہیں کہ گاؤں میں نماز جمعہ ادا کرتے پھریں اور احتیاط الظہر

پڑھتے رہیں کیوں کہ جب جمعہ گاؤں میں ناجائز ہے تو یہ نماز نفل ہوئی اور نوافل دن کے وقت باجماعت ادا کرنا وہ بھی تداعی کے ساتھ کراہت تحریمی ہے عجب ہے کہ فرض وقت تو تنہا تنہا پڑھیں اور نوافل نماز اذان اقامت خطبہ کے ساتھ۔ پھر مسجد میں اجتماع ہونے کے باوجود جماعت ظہر عمداً ترک کرنا گناہ کبیرہ ہوا وجوب کا قصداً ترک کرنا کس قدر معصیت ہے جن بعض فقہائے متاخرین نے فتویٰ دیا وہ محض اسی بنا پر ہے کہ جس بڑے گاؤں میں شہر ہونے نہ ہونے کے متعلق شک ہے مثلاً وہاں تین چار ہزار کی آبادی ہے اور بازار وغیرہ بھی ہیں تو وہاں کے لوگ بلا اذن قاضی یا امیر اگر جمعہ ادا کریں تو چار رکعات ظہر بھی بعد میں پڑھ لیں، تمام فقہا تصریح کرتے جاتے ہیں وتقع الجمعة فرضاً في القصبات، والقرى الكبيرة التي فيها اسواق الخ قصبات میں اگر جمعہ پڑھا جائیگا تو فرض ہی واقع ہوگا احتیاط وہاں بھی نہ ہوئی اور جن بڑے گاؤں میں جمعہ پڑھا جائے گا جہاں بازار ہوں تو وہاں بھی فرض واقع ہوگا امام ابوحنیفہؒ نے شہر کی یہی تعریف کی ہے فیہا سکک و اسواق الخ شامی فرماتے ہیں هذا هو الاصح ص ۵۶۰ ج ۱۔

اکبر مساجد والی تعریف کو فقہا نے تسلیم نہیں کیا، بحر، خیریہ، ردالمحتار، جامع الرموز میں فرماتے ہیں ان هذا الحد غير صحيح عند المحققين الخ شیخینؒ کے نزدیک منا میں اسی واسطے جمعہ جائز ہے کہ وہاں مکانات، دکانیں، گلیاں، کوچے، موجود ہیں اور موسم حج میں وہ شہر بنجاتا ہے۔ درمختار میں ہے وجازت الجمعة بمنى في الموسم الخ۔ آگے فرماتے ہیں:۔ لوجود الاسواق والسكك۔ ہدایہ میں ہے لانها تتمصر في ايام الموسم زمانہ حج میں وہ شہر بن جاتا ہے، امام محمدؒ وہاں بھی نہیں مانتے۔ پھر اس اختلاف کی کیا وجہ تھی اگر احتیاط ظہر تھا تو ائمہ ثلثہ یہی فرمادیتے کہ وہاں جمعہ بھی پڑھ لو اور ظہر بھی پڑھ لو معلوم ہوا کہ احتیاط الظہر نہ شہروں میں ہے نہ دیہات میں۔

حضرت مولٰنا کرامت علی صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ جس مقام کے شہر ہونے میں شک ہو اور وہاں کے لوگ جمعہ ادا کریں جمعہ کی سب شرطوں کے ساتھ، تو مناسب ہے کہ وہاں کے لوگ جمعہ ادا کرنے کے بعد چار رکعت ظہر کی نیت سے احتیاط کے واسطے پڑھ لیں کہ اگر جمعہ ادا نہ ہوا ہوگا۔ تو ظہر پڑھنے سے فرض وقت اس سے بے شبہ ادا ہوجائے گا (مفتاح الجنۃ ص ۔۔)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر اس مقام کے شہر ہونے میں (شہر کی تعریف امام اعظمؒ سے معلوم ہوچکی) شک نہ ہو تو وہاں احتیاط الظہر قطعاً نہیں نیز حضرت موصوفؒ کی عبارت سے پتہ چلا کہ ایسے مقام پر ظہر ہی باجماعت پڑھنا چاہئے۔ کیوں کہ ایسے مقام پر حضرت مولٰنا جمعہ کی ادائیگی کا حکم نہیں دیتے، یہ عبارت بالکل صاف ہے مطلب یہ ہے کہ اگر ایسے مقام میں لوگ جمعہ ادا کریں تو کیا کرنا چاہئے۔ القول البديع لاشتراط المصر للتجميع مؤلفہ حضرت تھانویؒ کے آخر میں حضرت محدث شوق نیمویؒ کا فتویٰ ثبت ہے ملاحظہ فرمائیے۔ علم الهدیٰ میں اسکی پوری تحقیق دیکھیے۔

حضرت مولٰنا محمد انور شاہ صاحب محدث اعظم قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ احتیاط الظہر بے محل ہے، جامع الآثار رسالہ مصنفہ حضرت شوقؒ عمدہ کتاب ہے اس کا ص ۱۴، ص ۱۵ دیکھیے، رسالہ علم الهدیٰ ص ۱۶، ص ۱۸ دیکھیے، اس کو بدعت فرمایا ہے اور ایسے علماء کو مبتدع فرمایا ہے۔ مولوی مصطفٰے رضا برکاتی نوری بریلوی نے لکھا ہے "جہاں جمعہ پڑھنا ناجائز ہے جیسے دیہات وہاں جمعہ پڑھنے کے بعد چار رکعت احتیاطی سے جمعہ کی اصلاح کرنا، ناجائز ہے یہ ہمارے ائمہ کرام سے کسی کا مذہب نہیں۔ علم الهدیٰ ص ۱۹، اس رسالہ کے آخر میں علماء کرام رام پوری بریلی وغیرہم کے دستخط ثبت ہیں۔

بہرحال اگر محض بربناء مفسدۂ عظیم جس کی تصریح فتوی احتیاط الظہر میں محدث گنگوہی قدس اللہ اسرارہم نے فرمائی ہے اور احتیاط الظہر کے خلاف فتوی دیا ہے تو جو ائمہ احناف و فقہاء حنفیہ خلاف گئے ہیں۔ اور حضرت گنگوہیؒ کے معاذ اللہ

ع۔ مستفسر نے اپنے سوال نامہ میں مولٰنا گنگوہیؒ کے فتوی پر شبہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے اگر ائمہ احناف نے صلوٰۃ احتیاط الظہر کی تائید کی ہے مگر مولٰنا گنگوہی نے مخالفت فرمائی ہے تو کیا مولٰنا گنگوہیؒ حنفی نہیں تھے، یہ ان کے اسی شبہ کا جواب ہے۔ ۱۲

حنفی ہونے میں شبہ آپ کو ہو تو یہ جمیع ائمہ بھی آپ کے فتوے سے بچ نہ سکیں گے ان مسائل پر مکرر سہ کرر بلکہ متعدد بار رسائل و فتاوے تحریر ہو چکے اب خواہ مخواہ ایسے مسائل میں اُلجھنا جبکہ نفس دین ہی ہاتھوں سے نکلا جارہا ہے کچھ دور اندیشی نہیں ہے۔ معلوم رہے کہ مولٰنا عبدالاول مرحوم نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ تعالےٰ کو مفید المفتی ص۱۴۵ میں اُن اکابر علماء حنفیہ میں شمار فرمایا ہے جن سے ان کو جسمانی ملاقات یا رُوحانی موانست و تعلق ہے جن کے وجود سے اِس چودھویں صدی کو بہت بڑا فخر حاصل ہے، لکھتے ہیں" مولٰنا رشید احمد محدث فقیہ گنگوہی صوفی"۔ حضرت گنگوہیؒ ساری عمر درس حدیث دیا پچاس سے زائد جلیل القدر اولیاء اللہ حضرت کے خلفاء ہیں خود حضرت کشمیریؒ قدس سرہٗ بھی حضرت سے مجاز تھے۔ مذہب حنفی کی تائید میں حضرت کی متعدد تصانیف ہیں:۔ الکوکب الدری، ہدایت المعتدیٰ، قطوف دانیہ، اوثق العریٰ، الرای النجیح فی التراویح، لطائف رشیدیہ، ہدایت الشیعہ، مکاتیب رشیدیہ، کو دیکھئے، اگر اتنی بات پر کسی بزرگ کو حنفیت سے نکالنا ہے کہ اپنے عمل کے خلاف ان کا عمل تھا تو پھر اُمت کا خدا حافظ ہے۔ بہرحال مسلک یہی حق ہے۔ مفید مفتی کو دیکھئے ص۷۳ سے ص۸۹ تک یہی لکھتے جارہے ہیں کہ عبادات میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ فتویٰ ظاہر مذہب پر ہوگا لیکن ایذان الوریٰ میں خوب غیر مقلدین کی تائید فرمائی گئی ہے۔ اور امام اعظمؒ کے مذہب کا خوب مذاق اُڑایا گیا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ط۔ اگر موضع شک میں احتیاط الظہر کی ضرورت ہوتی تو منا میں بزمانۂ حج اگر جمعہ کا دن آتا تو جمعہ مع احتیاط ظہر پڑھا جاتا۔ کیوں کہ شیخین کے نزدیک منا شہر بن جاتا ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک گاؤں رہتا ہے حالانکہ وہاں نہ جمعہ ہوتا ہے نہ عید، اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس مقام کو بعض گاؤں اور بعض شہر کہیں تو وہاں ظہر باجماعت پڑھنا ضروری ہے کیوں کہ فرض الوقت عندالاحناف تو ظہر ہی ہے۔ فافہم۔ آپ جامع الرموز ص۱۱۵ کو ضرور دیکھیں۔ جن بزرگوں کے آپ نے حوالے دیئے ہیں حضرت تھانویؒ تو اس میں شامل نہیں ہیں، باقی بزرگ اگر احتیاط پڑھتے ہوں گے تو اس کی وجہ بھی ہوسکتی ہے ابن نجیم رحمۃ اللہ تعالےٰ نے اخص الخواص کو خفیہ ادا کرنے کی تصریح کی ہے لیکن یہ شرط بھی لگادی کہ اپنے پڑھنے کی کسی کو اطلاع نہ دے، دیکھو بحر میں یہی لکھا ہے، لہٰذا اصل مذہب پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم و اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال و اعمال سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ احادیث مبارکہ میں تصریحات موجود ہیں کہ بعد صلوٰۃ جمعہ صرف سنت جمعہ پڑھی جائیں گی۔ اب تو حال یہ ہوگیا ہے کہ علماء اور بالعموم ائمہ مساجد جو احتیاط پڑھتے ہیں وہ جمعہ کی فرضیت تک سے منکر ہیں کہ ہم تو جمعہ کی نماز شہروں میں بھی نفل کرکے پڑھتے ہیں، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ ط پس اس زمانہ میں علماء کا فرض ہے کہ اس سے عوام کو منع کریں۔ والسلام مع الاکرام۔

کشفی مسائل کے لئے "فتوح الغیب" اور مکتوبات مجدد الف ثانی کا مُطالعہ فرمائیں خود تصانیف حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ محدث دہلوی ہی کافی ہیں، القول الجمیل میں تمام طرق تصوف میں مشائخ طریقت کے جُدا جُدا وضع ہیئت جلوس و تعداد اذکار و اوراد و اشغال مذکور ہیں، معلوم ہوا کہ کسی خاص تعداد یا وضع کو لابدی اور فرض و واجب کسی شیخ طریقت نے قرار نہیں دیا اپنے اپنے تجربات ہیں جو اپنے مُریدوں کو بطور علاج اُن کی استعداد کے مطابق تلقین فرماتے ہیں حتی کہ ایک ہی شیخ اپنے مُریدوں کو مختلف اشغال و اذکار و تعداد کلمہ طیبہ و اسم ذات، تلقین فرماتے ہیں جیسی اُس کی استعداد دیکھی، اسی واسطے احادیث میں اذکار کی تعداد بھی کئی طرح مذکور ہے اور خود اذکار بھی متعدد طرق سے مروی ہیں وللہ الاسماء الحسنیٰ قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایّاما تدعوا فلہ الاسماء الحسنیٰ۔

بہرحال کسی خاص تعداد کی پابندی شریعت نے لازمی نہیں کی۔ بعضوں کو تھوڑے ہی دن کی محنت سے آثار ذکر پیدا ہوجاتے ہیں۔ بعضے بیچارے چلہ در چلہ لگے رہتے ہیں۔ والسلام

(مولٰنا محمد انوری لائل پوری)

چوتھی قسط:-

تذکرہ بزرگانِ دیوبند:-

حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ

(از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی اُستاذ مدرسہ عربیہ امروہہ)

نگینہ میں تقریر

۱۳۲۲ھ مطابق سنہ ۱۹۰۴ء کو نگینہ ضلع بجنور میں آریوں سے مناظرہ ہوا، اُس میں حضرت محدث امروہیؒ اور اُس وقت کے تقریباً تمام مشاہیر اکابر نے شرکت فرمائی تھی۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مغفور نے فریقِ ثانی سے مناظرہ کیا۔ کئی دن تک محفل مناظرہ گرم رہی، غالباً تقدیر کا مسئلہ فریقِ ثانی کی طرف سے چھیڑ دیا گیا تھا جو طول پکڑ گیا تھا اور کسی طرح سمٹنے میں نہیں آتا تھا، اِدھر عوام الناس کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا سخت اندیشہ تھا اسی دوران میں ایک رات حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خواب دیکھا کہ "ایک دریا ہے اُس کے ایک کنارے پر شیخ الہندؒ بیٹھے ہیں، اور دوسرے کنارے پر حضرت قاسم العلوم تشریف فرما ہیں، حضرت شیخ الہندؒ نے عرض کیا کہ حضرت میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں کوئی کشتی ہے نہیں جس کے ذریعہ میں آپ تک پہونچوں، کیا کروں؟" فرمایا "اس کی تدبیر میر احمد حسن سے دریافت کرو" صبح کو حضرت شیخ الہندؒ نے اس خواب کی تعبیر خود ہی نکالی کہ "دریائے مناظرہ سے پار ہونے کی تدبیر میر احمد حسن صاحب امروہی بتلائیں گے۔" چنانچہ وہ اُن کے پاس پہونچے، اور فرمایا کہ "رات میں نے اُستاد مرحوم کو خواب میں دیکھا ہے یہ صورت واقعہ تھی اور اُنھوں نے یہ فرمایا ہے۔"

حضرت امروہیؒ نے اولاً بطور انکسار فرمایا کہ "یہ خواب و خیال کی بات ہے۔" اس کے بعد فرمایا کہ "اگر ایسا ہی ہے تو میں ایک مشورہ دیتا ہوں اُس پر عمل کر لیا جائے، اور وہ یہ ہے۔ کہ مناظرہ ملتوی کر دیا جائے، ایسا ہو جائے کہ ایک وکیل آریوں کا اپنے مذہب کے اثبات میں تقریر کرے اور اُس کو بالاتر ثابت کر دکھائے، اور دوسرا وکیل مسلمانوں کی طرف سے ہو جو مذہب اسلام کی تمام مذاہبِ عالم پر فوقیت اور اُس کا باعثِ نجات ہونا عقلی دلائل سے ثابت کرے اور مجمع عام میں ہر دو مذہب کے وکیل اپنی اپنی تقریر پیش کر دیں۔"

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آریوں نے بھی اس کو مان لیا۔ مسلمانوں کی طرف سے متفقہ طور پر حضرت محدث امروہیؒ وکیل بنائے گئے۔ آپ نے آریوں اور عیسائیوں کے بھرے مجمع میں ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی جس میں عقلی دلائل کی مدد سے اسلام کی جملہ مذاہبِ عالم پر فوقیت و برتری ثابت کی۔

اس تقریر میں توحید، رسالت، مقصدِ زندگی اور سیرتِ رسولؐ و سیرتِ صحابہؓ پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے حضرت مولانا نانوتویؒ کا رنگ اس تقریر میں پورا پورا جھلک رہا ہے۔ افاداتِ احمدیہ یا دعوۃ الاسلام کے عنوان سے یہ تقریر شائع ہو گئی ہے، اور ۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ روداد مناظرہ نگینہ میں بھی چھپ چکی ہے، ہر مبلغ اسلام اور حکمت و عقل کی روشنی میں ملتِ بیضا کی بالاتری ثابت کرنے والے کو اس تاریخی تقریر کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ آگے اس کے کچھ اقتباسات پیش کئے جائیں گے۔ لیکن کل تقریر کا لطف ہی کچھ اور ہے، اس تقریر کا یہ اثر تھا کہ تمام مجمع دم بخود تھا بعض غیر مسلموں نے اس کو سنکر یہ کہا کہ اگر کسی تقریر پر ایمان لے آنا چاہئے تو یہ تقریر ایسی ہی تھی۔

حضرت محدث امروہیؒ نے اپنی اس تقریر کے متعلق مفتی محمد سہول صاحبؒ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند سے فرمایا تھا[1] کہ "تقریر کرتے وقت مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں، بس یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُستاد مرحوم پاس کھڑے ہیں اور جو وہ بتلاتے ہیں وہ بول رہا ہوں جب وقت ختم ہوا، اور اُس کی اطلاع دی گئی تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری تقریر کا وقت ختم ہو گیا۔"

سچ ہے ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ اُستادِ ازل گفت ہماں می گویم

محمد ابراہیم صاحب پھلاودی المتخلص بہ ذوقؔ نے تقریر نگینہ کے متعلق حسب ذیل قطعہ کہا ہے ؎

تیغِ زبانِ حضرتِ احمد حسن نے کیا
مضمونِ آبدار کا جوہر دکھا دیا
ایسی لگائی مہر مخالف کے مُنھ تھے بند
کیا ہی نگینے پر یہ نگینہ جما دیا
کانوں نے جو سُنے وہ مضامین عجیب تھے
آنکھوں سے علمِ قاسمی سب کو دکھا دیا
مشتاق تھے جو حضرتِ قاسمؒ کی دید کے
گویا جمالِ قاسمی اُن کو دکھا دیا
رد کر دیا دلیل سے کیا خوب ... کو
تقریرِ قاسمی کا نمونہ دکھا دیا

---

[1] مفتی صاحب مرحوم نے یہ واقعہ خود مجھ سے بیان کیا تھا اور فرمایا تھا کہ ایک مرتبہ میری ملاقات ریل میں حضرت مولٰنا امروہیؒ سے ہوئی اور اُن کے ہاتھ میں (غالباً) رودادِ مناظرہ نگینہ تھی۔ میں نے اُس روداد میں حضرت کی تقریر کو پڑھا اور پڑھ کر عرض کیا کہ حضرت یہ تقریر تو بالکل مولٰنا نانوتویؒ کی سی معلوم ہوتی ہے، فرمایا 'ہاں ایسا ہی ہے' اور پھر یہ سب واقعہ حضرت شیخ الہندؒ کی خواب وغیرہ کا خود ہی بیان فرمایا' اور فیضانِ حضرت نانوتوی رح کا ذکر کیا۔

تقریر نگینہ کے اقتباسات

شروع میں مجمع کے حسب حال خالص انسانیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعد خطبہ مسنونہ یہ تمہیدی کلمات ارشاد فرمائے :-

"اے حاضرین جلسہ! اور اے حاضرینِ مجلس! یہ بندۂ ضعیف اور آپ حضرات بلکہ سب بنی آدم ایک ماں باپ کی اولاد ہیں

؎ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند + کہ در آفرینش زیک جوہر اند

اِس لئے ہر ایک پر ضرور ہے کہ باہمدگر ایک دوسرے کی پوری ہمدردی کرے اور کامل خیر اندیشی۔ مجھ پر لازم ہے کہ بحقِ ہمدردی آپ حضرات کی خیر اندیشی میں تا امکان کوشش کروں، میں اپنے خدائے برتر وحدہٗ لاشریک لہٗ کو گواہ کر کے قسم کھاتا ہوں کہ مجھ کو اس وقت کھڑے ہو کر جو کچھ عرض کرنا مقصود ہے اُس سے صرف آپ حضرات کی خیر اندیشی مقصود ہے اپنا کوئی مطلبِ ذاتی نہیں۔ لہذا بہ ہزار نیازمندی یہ آرزو ہے کہ آپ حضرات میری جملہ معروضات کو فضول نہ سمجھیں اور انصاف کے ساتھ بہ توجہ خاطر سُنیں۔"

اِس کے بعد نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ توحید ذاتی و صفاتی پر بحث فرمائی بعدہٗ رسالت کا اثبات کرتے ہوئے فرمایا :-

"صاحبو! پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میرا ان تمام معروضات سے کوئی مطلب ذاتی نہیں صرف بحق "اُخوّت و اتحادِ نوعی" آپ حضرات کی خیر اندیشی اپنا مقصود ہے۔ اور حقِ ہمدردی پر ان معروضات کی بنا ہے۔ پس بہزار نیازمندی گزارش ہے کہ یہ زمانۂ نبوت محمدی صلے اللہ علیہ وسلم ہے بغیر اتباعِ محمدی نجات کا ملنا محال۔ اگر سچی نجات کی طلب ہے (تو) وہم و خیال کے اتباع کو چھوڑ دو اور عقلِ صحیح اور قوت علمیہ ...... اس مرتبہ (درجہ) کام کو کون غالب ہو اور وہم وخیال کو

اپنا تابع کر چھوڑے۔ حق کو حق دکھلائے اور باطل کو باطل"۔

صاحبو! اُن کے (انبیاء کے) اتباع سے انکار اور اُن کی رسالت کی عدم تصدیق دو حال سے خالی نہیں زیادہ اشخاص منکرین اپنے کو اور اپنے وجود و بود کو بہمہ جہت مستقل جانتے ہیں اور غیر مخلوق اور انعاماتِ خالق برتر سے جن پر بنائے حقِ عبودیت ہے بالکل مستغنی۔ اور یا اپنا وجود و بود اور اپنا خلق دوسرے خالق کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں اور دوسرے کا حقِ عبودیت اپنے پر لازم — اور ظاہر کہ — دونوں شقین کھلی شرک کو مستلزم — اور علی کلا الشقین اقرارِ توحید باطل — پس ثابت اور واضح ثابت کہ اقرارِ توحید کو اقرارِ رسالت نیز لازم — اور رفع لازم چوں کہ رفع ملزوم کو مستلزم — لہٰذا انکارِ رسالت انکار توحید کو نیز مستلزم —

صاحبو! — بالیقین جانو کہ بغیر اقرارِ رسالت محمدی آپ صاحبوں کا اپنے کو موحد کہنا غلط ہے بیشک شرک ہے اور شرک کو مستلزم"۔

اُس کے بعد سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا :۔

"اب شاید یہ خلجان ہو کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا علوم راسخہ و ملکات فاضلہ میں کامل و اکمل اور سب سے اعلیٰ و افضل ہونا کیونکر ثابت اور آپ کی تعلیم میں کیا خوبی — سو میں ناکارہ ژولیدہ بیان کہ جس کو نہ کمال علمی حاصل نصیب نہ کمالِ عملی حاصل اُن معارف الہیہ و مواہب لدنیہ یعنی اُن علوم راسخہ و ملکات فاضلہ کی کہ قلب محمدیؐ جن کا مخزن تھا اور معدن — اس تھوڑے سے وقت میں کیا تفصیل کر سکتا ہوں، اور بجز اس اجمال کے کہ جو جو کمالات دوسروں میں فرادیٰ فرادیٰ تھے اس مرکز کمالات میں سب مجتمع تھے اور عالم مخلوق میں وہ منفرد الذات و الصفات، اس مصرعہ کا مصداق صحیح

ع "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری"

اور کیا کہہ سکتا ہوں — مگر تاہم "اندکے از بسیارے" و "مشتے نمونہ از خروارے" آپ کے فضائل علوم و محاسن اخلاق و احوال کو اپنے علمِ ناقص کے اندازہ کے موافق کچھ تھوڑا سا بیان کرتا ہوں۔ — سو سُنیئے :۔

آپ ایسے زمانۂ پر آشوب میں مبعوث ہوئے، کہ جہالت و ضلالت کا پورا زور تھا اور کفر و شرک کا پورا جوش، کفر و شرک کی بغاوت و سرکشی کا اثر تا "آستانۂ عالیہ" پہونچا ہوا تھا جاہلانِ عرب نے خود "دار السلطنت" و دربارِ شاہی یعنی خانۂ کعبہ کو بتکدہ بنا رکھا تھا — اور خود حاضر باشان درگاہِ اقدس و ساکنانِ مکۂ معظمہ شرک و کفر میں مبتلا — اور وہ بھی اِس مرتبہ (درجہ) کہ ایک نہیں دو نہیں بقدرِ شمارِ ایامِ سال خانۂ کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے اور بقول شخصے ؎

ہر روز انھیں چاہیئے اک تازہ خریدار
صورت مری ہر روز بدل جائے تو اچھا

ہر دن کے لئے نیا بُت تھا۔ مُلکِ عرب کی یہ جہالت یہ بد اخلاقی کہ باپ بیٹے کا اور بھائی بھائی کا دشمن — اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا۔ عرب کی جہالت، عرب کی خانہ جنگی ضرب المثل — آپ کی وہاں ولادت اور وہاں بعثت اور وہ بھی اس حال میں کہ نہ باپ سر پر، نہ دادا۔ چچا کی سرپرستی اور تربیت میں پرورش پائی، یہ حالت کہ فقر و فاقے پر مدار — سامان علم و تہذیب و سامان ترقی کہاں تھے؟ اور کیونکر میسر — بقول شخصے "نہ یارے نہ مددگارے نہ زورے نہ زرے — بلکہ آپ محض اُمی رہے اور پڑھے لکھوں کی صحبت تک بھی میسر نہ ہوئی، اس پر جب آپ نے بعد بعثت کلمۂ توحید کی تبلیغ کی اور شرک بیخکنی کی — ہر زن و مرد، چھوٹا بڑا آپ کا دشمن ہو گیا اور جو اذیتیں آپ کو دیں سب کو معلوم — آخر یہ نوبت کہ اپنا وطن مکۂ معظمہ چھوڑنا پڑا۔

بایں ہمہ بےکسی و بیگانگی اُمّی ہوکر ملک عرب کو اپنے کمالات علمی و عملی کے ساتھ اس مرتبہ ممتاز فرمایا اور اس درجے کا مہذب کہ اُن کا علم اور اُن کی تہذیب ضرب المثل ہوگئی۔ شرک کی جڑ بیخ کنی فرمائی کہ تمام جزیرۃ العرب میں گو اور معاصی ہوں مگر نہ شرک ابتک ہوا نہ انشاء اللہ آئندہ کو الیٰ یوم القیٰمۃ ہو ـــ وہاں کے عوام وجہال کی وہ پختہ توحید کہ دوسری جگہ کے علماء و خواص کو بھی نصیب نہیں۔ قبائل کے قبائل جن میں دوامی عداوت تھی اُن کا باہمی عناد اور فساد بوجہ توارث و دوام کے گویا جبلی ہوگیا تھا، جیسے اوس و خزرج ـــ آپ کے فیضِ صحبت اور آپ کے اخلاق حمیدہ کی بدولت ایک جان دو قالب ہوگئے اور اور شیر و شکر ہوکر رہنے لگے ـــ

صاحبو! ـــ یہ جملہ اثرِ نیک ـ علوم راسخہ وملکاتِ فاضلہ محمدی اور آپکے اخلاق کاملہ کا تھا یا اور کچھ؟ ـــ

اس کے بعد فرماتے ہیں :-

صاحبو! کسی کی سچی بزرگی و مقبولیت اور اُس کے اصلی باکمال ہونے کا یہ بڑا ثبوتِ کامل ہے کہ اُس کے گھر کے لوگ اور اہلِ قرابت زن و فرزند، بھائی برادر اور اُس کے ہر وقت کے خدمتی۔ یارانِ مجلس و حاضر باشانِ خدمت کو اُس کے ساتھ خالص عقیدت ہو، دل و جان سے اُس کے فریفتۂ کمالات ہوں اور جان و مال سے اُس پر شیدا، چند روزہ صحبت کو اغیار کے ساتھ اخلاق و عادات حمیدہ اور اعمال و احوال حسنہ مصنوعی ظاہر کرکے گذارنا سہل اور مصنوعی طور پر اُن کے سامنے بزرگ بننا آسان مگر ہر وقت کے حاضر باشان خدمت جن کو درونی و بیرونی معاملات و عادات سے پوری اطلاع ہوتی ہے، اور اُن پر کوئی حالت ظاہری و باطنی مخفی نہیں رہ سکتی تاوقتیکہ وہ ملکاتِ فاضلہ۔ جبلی و اصلی نہ ہوں، بیشک فریفتۂ کمالات ـــ سچے مخلص اور پورے عاشق نہیں ہوسکتے"۔

بعدہٗ خوبیٔ تعلیم محمدی و اخلاق محمدی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

آپ کی خوبیٔ تعلیم اس مرتبہ کہ بعد بعثت تھوڑی مدت میں آپ نے دین قویم کی کہیں سے کہیں اشاعت فرمائی اور بعد وفات اپنی تعلیم کا وہ سچا اثر چھوڑا کہ بغیر سامانِ حرب و ضرب و بغیر قوت زور و زر فقر و فاقہ کی حالت میں افضالِ خداوندی کے بھروسے پر تھوڑی جماعتِ صحابہ کو سلاطین کا مقابلہ کرنا سہل ہوا، اکناف عالم میں اس دینِ پاک کی روشنی پھیل گئی ـــ خزائنِ سلاطین، غنیمت میں داخل ہوئے اور پھر وہ سچا اثر اب تک باقی کہ بفضلہٖ تعالیٰ اِس دم تک وہ روشنی پھیل رہی ہے اور پھیلتی جاتی ہے زمانۂ حیات میں بعض سلاطین زمانہ آپ کے آستانِ عالی کے غلام ہوئے اور فتوحات کی ہر طرف سے آمد مگر آپ کا زہد فی الدنیا اس مرتبہ (درجہ) کہ حضرت عائشہؓ زوجہ مطہرہ حضور اقدس روایت کرتی ہیں کہ مہینوں آپ کے گھر میں نہ چراغ جلتا تھا نہ آگ روشن ہوتی ـــ مدار قوت پانی اور مدینہ کی کھجوروں پر ـــ بیشتر کھانا آپ کا جَو کی روٹی تھی ـــ ہمیشہ موٹے قسم کا لباس پہنا ـــ وہ لباسِ پاک جس میں حضورؐ نے وفات پائی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں موٹی قسم کا تھا ـــ اور اُس میں پیوند لگے ہوئے تھے ـــ ہاں عبادات و مرضیات خالق میں یہ سرگرمی کہ راتوں کھڑا رہنا اور عبادات و ریاضات شاقہ میں بسر کرنا ـــ

ـــ صاحبو! حضور سرورِ عالم اور آپ کے آل و اصحاب کی یہ مختصر سوانحعمری ہے جس سے آپ کا نبیؐ اور سچا مُلہم ہونا واضح ثابت ـــ بے شک مُلہم کی سچائی کی بڑی دلیل اُس کی سوانح عمری ہوسکتی ہے۔

ـــ دیکھو ان سوانحِ محمدیؐ و اصحاب محمدیؐ سے آپکے علوم راسخہ اور اخلاقِ فاضلہ کا علیٰ وجہ الکمال و الاکمل ہونا کس مرتبہ (درجہ) بداہۃً ثابت ہوتا ہے اور علیٰ ہذا آپکی خوبیٔ تعلیم کس درجہ روشن، یہی توجہ ہے کہ ہم خود آپ کی

ذاتِ جامعِ کمالات کو سب سے اعلیٰ سب سے افضل اعتقاد کرتے ہیں، اور دوسروں کو اس اعتقاد کے ساتھ مکلف — جس کو تردد ہو دوسروں کے کمالات علمی وعملی اور دوسروں کی سوانح عمری دکھائے اور موازنہ کرے ؎

یا تنگ نہ کر ناصحِ ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھائے دہن ایسا کمر ایسی

سوانح محمدی کے بعد ارکانِ نماز کی خوبی عقلی حیثیت سے بیان فرمارہے تھے کہ وقت ختم ہوگیا۔ تقریر کے آخر میں فرمایا:—

"افسوس کہ مجھ پر وقت معینہ کی مدت پوری ہونے کی اطلاع دے کر بار بار تقاضہ کیا جاتا ہے کہ کہ میں اس بیان کو ختم کروں اور اس کے دائرۂ وسیع کو تنگ — ناچار میں بیٹھتا ہوں۔ کاش مجھ کو وقت کی توسیع ہوتی تو انشاء اللہ تعالےٰ تمامی احکامات شریعت محمدیہ کی لِم وحکمت کو پوری توضیح کے ساتھ واضح کر دکھاتا۔ اور چونکہ محکوم تھا کہ جو کچھ کہوں بروئے عقل کہوں لہٰذا ہر مدعا ہر مطلب کو اپنی عقلِ نارسا کے موافق عقلی دلائل وعقلی براہین سے ثابت کیا گیا ہے، اگر قصور ہو میری عقلِ نارسا کے حوالے فرمایا جائے۔ الحمد للہ الذی کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ +

چند درخواستیں!

جنہیں آپ نے ابھی تک قبول نہیں کیا!

(۱) رسالہ کے خریدار اگر اس امر واقعہ کی طرف توجہ کریں کہ چونکہ رسالہ "دار العلوم" کا آرگن ہے اس لئے رسالہ کا نقصان براہِ راست دار العلوم کا نقصان ہے اور مسلمانوں کے ایک ایسے ادارہ کو جس کے لاکھوں روپے سالانہ کے مصارف کو مسلمان ایک ایک پیسہ دیکر پورا کرتے ہیں نقصان پہونچانا خود اپنے لئے بڑا خسارۂ دینی پیدا کرلینا ہے، تو انشاء اللہ وہ دوسرے سال کی وی، پیوں کو واپس کرنا ترک کرسکتے ہیں، جو حضرات خریدار نہیں رہنا چاہتے وہ اپنے اوقاتِ عزیز کا ذرا سا حصہ صرف فرماکر ذریعۂ کارڈ اطلاع دیں، اُن کی خاموشی ہمیں وی، پی روانہ کرنے کی اجازت کے معنی رکھتی ہے، اور وی، پی منگاکر واپس کرنا اخلاقی اور دینی جرم ہے۔

(۲) پاکستان، ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے جن حضرات کے نام وعدے پر رسالہ جاری ہے وہ ہماری مالی پریشانیوں کا لحاظ فرماکر اپنی پہلی فرصت میں چندہ روانہ فرمائیں۔ ہم اُن حضرات کی فوری توجہات کے منتظر ہیں۔ اگر ان حضرات کا چندہ فوری طور پر وصول نہ ہوا تو اُن کا رسالہ بند کرلیا جائے گا۔

(۳) پاکستان کے قدیم وجدید خریدار ندا حرم کراچی کو رسالہ دار العلوم کی کوئی رقم نہ بھیجیں۔ ندا حرم کراچی سے ہمارا لین دین کا تعلق ختم ہوچکا ہے، ہمارا پاکستان کا نیا پتہ یہ ہے:— "مولٰنا محمد صاحب انوری مہتمم مدرسہ تعلیم الاسلام۔ محلہ سنت پورہ، لائل پور" منی آڈر سے اس پتہ پر چندہ روانہ کرکے رسید ہمیں بھیجدیں قدیم خریداروں کو نمبر خریداری لکھنا ضروری ہے +

(ناظم رسالہ)

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

(جناب احسان الحق قریشی ڈی، کام (لنڈن) انچارج کمرشل سنٹر سیالکوٹ)

"حضرت مولانا تھانویؒ کا نام آتے ہی تصور میں علم و فضل، دین و دیانت اور حکمت و بصیرت کا ایک دریائے ناپیداکنار موجزن ہوگیا۔ ہر انسانی زندگی کے فرائض و کمالات کے مختلف گوشے ہوتے ہیں، اور جن انسانوں کو فیضانِ ایزدی سے اچھی صلاحیتیں ملتی ہیں وہ ان سب گوشوں میں اپنے نمایاں اور ممتاز کردار کا ثبوت دیتے ہیں، مولانا کی زندگی میں بھی علم و عمل کے مختلف کمالات جمع تھے مگر اُن کی یہ خصوصیت تو بہت عرصہ تک یاد رہے گی کہ انہیں انسانی سیرت کی تعمیر اور تزکیہ و تخلیۂ باطن کا ایک قدرتی سلیقہ حاصل تھا حضرت مولانا نے صرف اپنے قلم سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی شریعت و طریقت کی بقا و جلا اور صفا کے لئے بڑی خدمت انجام دی، مولانا تنہا اپنی ذات گرامی سے جتنا کام کر گئے' اب ممکن نہیں کہ کوئی انجمن' ادارہ یا جماعت بھی اتنا کام کر سکے'۔

ذیل میں انگریزی تعلیم یافتہ مگر دینی ذوق رکھنے والے ایک صاحب کا مضمون حاضر ہے جس میں اُنہوں نے حضرت مولانا تھانویؒ کے متعلق اپنے تأثرات بیان کئے ہیں، مضمون علمی اور تحقیقی نہیں ہے مگر بزرگانِ دین کا ذکر بھی دینی اور علمی فائدے سے خالی نہیں ہوتا۔"

(سید محمد ازہر شاہ قیصر)

زباں پہ بارِ خدا یا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

بغیر مبالغہ کے یہ میں عرض کرتا ہوں کہ میں اکثر دفعہ بطور شکرانہ سربسجود ہوا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت بخشی کہ میں نے حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور محدث دوراں، عالم باعمل، غزالیٔ وقت مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی زیارت کی اور ان دونوں قابل قدر ہستیوں کی مجالس میں مجھ سے ہیچمداں کو بیٹھنے کے قیمتی مواقع باری تعالیٰ نے بخشے۔ اس فرصت میں میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

میں اپنے آبائی وطن امرتسر شہر میں ۱۹۳۶ء و ۱۹۳۷ء میں طالب علمی کا زمانہ بسر کر رہا تھا۔ میری نشست و برخاست اکثر مولانا طبیب اللہ صاحب امرتسری مرحوم و مغفور سابق ہیڈ کلرک محکمہ انہار (ان کا انتقال ۱۹۵۰ء میں سرگودھا میں ہوا) اور محترم حکیم محمد علی صاحب امرتسری (حال گوجرانوالہ) کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہیں سے حضرت مولانا تھانویؒ کی کچھ کتب و رسائل دیکھ کر تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا۔ تحقیق حق کے الفاظ میں نے اس لئے استعمال کئے ہیں کہ میرے اکثر رشتہ دار مثلاً والد محترم خسر برادرانِ نسبتی وغیرہ علمائے دیوبند کے مسلک کے سخت خلاف تھے اور میرے عقائد بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ میرے اکثر رشتہ دار، تو تادم تحریر اپنے پرانے مسلک پر ہی چل رہے ہیں مگر اللہ تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے کم از کم ہم دونوں بھائیوں کے عقائد کو اِن بزرگوں کے قدموں کے طفیل حق پر ثابت قدم (باوجود مخالفت کے) رکھا۔ میرا اشارہ اپنے چھوٹے بھائی مولانا خالد محمود قریشی امرتسری ایم، اے کی طرف ہے جو سیالکوٹ کالج میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں اور جن کے مضامین رسالہ ھذا میں بھی کبھی کبھی شائع

ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت کی چند کتب پڑھ کر احقر نے بُنیادی عقائد کے متعلق اپنے چند وساوس حضرت کی خدمت میں تھانہ بھون لکھ بھیجے۔ حضرت نے میرے خطوط واپس کر دیئے اور اُن کے حاشیہ پر میرے وساوس کا ایسا مدلّل جواب لکھا کہ دل کو تسلی ہو گئی اور حضرت کی کرامت سے میرے عقائد کی مدلّل اصلاح ہو گئی (افسوس کہ وہ خط و کتابت امرتسر میں ہی تقسیمِ ہند کے فسادات کے وقت نذرِ آتش ہو گئی، ورنہ اِرادہ تو یہ تھا کہ کبھی اُسے شائع کرایا جائے گا) ابتدائی خط و کتابت کے بعد بھی چند وقفوں کے بعد مراسلت کا سلسلہ جاری رہا، اور بعد میں کئی دفعہ ارادہ ہوا کہ تھانہ بھون خود پہنچوں اور زیارت سے مشرف ہونے کی سعادت حاصل کروں مگر اس بات کی شرم مانع رہی کہ میری بدقسمتی سے میرا مغربی لباس اور ــــ شباہت مجھے اُس مجلس کے قابل بھی رکھے گی یا نہیں؟۔

آخر کار ہمت کر کے احقر نے حضرت والا سے بذریعہ خط و کتابت بیعت کی درخواست کر ہی دی۔ حضرت نے اُس کے جواب میں مجھے تحریر فرمایا کہ پہلے رسالہ "قصد السبیل الیٰ المولیٰ الجلیل" پڑھو اور پھر بیعت کی درخواست کرو کیوں کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے یہ رسالہ تا حال نہیں پڑھا۔ فرمودہ کے مطابق احقر نے رسالہ قصد السبیل کو کئی بار پڑھا اور حضرت کی خدمت میں بیعت کی درخواست کی۔ اُس کے جواب میں حضرت نے چند سوالات اِسی رسالہ کے مفہوم کے متعلق تحریر فرمائے جو کہ مجھے اس وقت اگرچہ یاد تو نہیں رہے مگر اتنا یاد ہے کہ احقر حضرتِ اقدس کے اس امتحان میں بفضلِ تعالیٰ کامیاب ہوا۔ اور حضرت نے بکمالِ مہربانی احقر کی بیعت بذریعہ خط و کتابت قبول فرمالی ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گُل!
نسیمِ صبح تیری مہربانی!!!

اِس واقعہ کے چند ماہ بعد ہی راقم الحروف کو بصیغۂ ملازمت رائل انڈین نیوی بمبئی میں بطور اسٹینو گرافر جانا پڑا اور یہ ملازمت میں نے تھوڑے عرصہ بعد ہی چھوڑ دی تھی اور پھر عثمانیہ ٹیکنیکل کالج حیدر آباد دکن میں ملازمت کا سلسلہ بطور پروفیسر شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) شروع ہو گیا تھا، اور دل یہ برداشت نہ کر سکا کہ امرتسر سے بمبئی یا حیدر آباد دکن جاتے وقت سہارنپور ریلوے اسٹیشن کو ویسے ہی چھوڑ جاؤں اور تھانہ بھون جا کر حضرت کا شرفِ قدمبوسی حاصل نہ کروں۔ اِس وقت تو میں یہ بھول چکا ہوں کہ میرا یہ سفر پہلا تھا، یا دوسرا، مگر بہر حال احقر نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی ٹھان ہی لی اور چنانچہ اُس مجلس علم و عرفان میں احقر پہنچ ہی گیا۔

وہاں اور حضرات کے علاوہ اُس وقت خواجہ عزیز الحسن مجذوب ایم، اے، ایل ایل، بی سابق ڈپٹی کلکٹر میرٹھ (جو کہ بعد میں حضرت والا کے فرمان کے مطابق اپنی درخواست پر انسپکٹر آف اسکولز متعین ہو گئے تھے) بھی موجود تھے۔ خواجہ صاحب کو میں جانتا تھا، اور ایک دفعہ کسی دوست کی تقرری کے سلسلہ میں اُن سے واسطہ بھی پڑا تھا، اور خواجہ صاحب بھی مجھے جانتے تھے۔ یہاں چند سطور خواجہ صاحب کی ذات بابرکات کے متعلق لکھنا مضمون کو طول نہیں دیگا۔ خواجہ صاحب مرحوم حضرت والا کے اُن سچے عاشقوں میں سے تھے جن کے متعلق شاعر نے یہ کہا ہے ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں۔ من دیگرم تو دیگری

خواجہ صاحب نے حضرت والا کی سوانح عمری "اشرف السوانح" تین حصّوں میں لکھی ہے جو اگرچہ آجکل پاکستان میں تو نہیں ملتی۔ مگر بھارت سے منگوائی جا سکتی ہے اور پڑھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ خواجہ صاحب موصوف پندرہ سال کے قریب یو، پی کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر رہے اور پراونشل سول سروس کے سینیر آفیسر تھے۔ حضرت والا کی توجہ نے وہ اثر دکھایا ؎

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بُوئے تو

حضرت والا پسند نہیں فرماتے تھے کہ خواجہ صاحب ایسی ملازمت پر متمکن رہیں جہاں کہ قریباً روزانہ خلاف شریعت فیصلے دینے پڑتے ہوں اور حضرت والا کے اظہارِ ناپسندیدگی کی یہ ہی تھی کہ

اِدھر خواجہ صاحب نے محکمہ سول سے محکمہ تعلیم میں تبادلہ کی درخواست دے دی، جو حضرت والا کی دُعاء سے فوراً منظور ہو گئی۔ اور خواجہ صاحب اُسی تنخواہ پر ڈویژنل انسپکٹر مدارس متعین ہو گئے۔ احقر کو اُس وقت تک جن حضرات سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے (از متوسلین حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ) اُن میں سے ان تین اصحاب میں بعینہٖ حضرت والا کا رنگ پایا۔ وہی طرزِ تکلم، وہی مجلسِ علم و عرفان، اور ان حضرات کے پاس بیٹھنے سے وہی دُنیا سے احساساتِ نفرت!!! میرا مطلب ان حضرات سے ہے (۱) مولانا مفتی محمد حسن صاحب خلیفہ حضرت مولانا تھانوی (۲) خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ اور (۳) مولانا سید سلیمان ندوی (جن کو اب مرحوم و مغفور لکھتے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے) جن حضرات کو حضرت ندوی علیہ الرحمۃ سے اُن کے آخری سالوں میں مُلاقات کا موقع ملا ہے، اُنہوں نے دیکھا ہو گا کہ اُن پر بھی کس طرح حضرت والا کا رنگ غالب آگیا تھا، راقم الحروف کو کراچی میں اُن سے شرفِ نیاز حاصل ہوا تو مجھے فوراً تھانہ بھون یاد آگیا۔ اللہ اللہ!!! کیسی ہستی تھی حضرت مولانا تھانوی کی ذات بابرکات، اور کیسی کیسی ہستیاں اُن کی توجہ سے شمعِ ہدایت بنکر چمکیں۔ سلف کی یادگاروں میں سے پاکستان میں اس وقت بہت تھوڑی ہستیاں رہ گئی ہیں۔ اللہ تعالےٰ مولانا مفتی محمد حسن صاحب خلیفہ حضرت تھانوی کا سایہ دیر تک ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ کیونکہ اب نیلا گنبد لاہور میں ہی تشنہ کام تسکین پاتے ہیں اور یہ شمعِ ہدایت اپنی ضیا پاشیوں میں مصروف ہے ؎

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

یا:- سالہا باید کہ یک مردِ خدا پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن!

مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کا انتقال حال ہی میں کراچی میں ہوا ہے۔ اُن کے واصل بحق ہونے پر لاہور کے اخبارات نے اپنے اتوار کے اڈیشن یا شیوع میں (۳ ۱۱/۵۳ کے شیوع۔ تاریخ ایک دن بعد کی ڈالی جاتی ہے) حضرت ندوی کی حیات پر مختلف مقالات لکھے مگر افسوس کہ جس شمعِ ہدایت کی ضیا پاشیوں کی بدولت حضرت ندوی نے روحانیت، تصوّف و سلوک میں کمالات پیدا کیے اُس کا ذکر سوائے "نوائے وقت" لاہور کے (سوانح از مولانا حکیم رشید احمد ندوی) کسی اور اخبار نے نہیں کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا ندوی کے علمی اور ادبی کمالات میں مولانا شبلی نعمانی کا کافی ہاتھ تھا مگر رُوحانی مدارج اور کمالات تصوّف و سلوک میں مولانا ندوی کا درجہ وہی شخص جان سکتا ہے، جس نے تقسیم ہند کے بعد مولانا ندوی کی مجلس میں شرکت کی ہو۔ حکیم رشید احمد ندوی لکھتے ہیں:-

"تصنیف و تحقیق اور علمی مسائل پر غور و فکر کے ساتھ ساتھ سید ندوی صاحب کی اصل افتادِ طبیعت بھی اپنا کام کرتی رہی یعنی وہ لمحہ و لمحہ ایثارِ نفس، خلوص فی الدین تزکیۂ نفس اور تصوّف کی جانب مائل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دن آیا کہ اس فطری جوہر نے انھیں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی بارگاہ میں لا کر کھڑا کر دیا اور وہ مولانا تھانوی کے مُریدوں میں شامل ہو گئے اس ارادت کے بعد سید صاحب کی زندگی میں تصوّف کا گہرا رنگ آیا اور وہ دنیاوی نمود و نمائش کی مکروہات اور حظِ نفس کی مقناطیسی قوتوں سے زیادہ سے زیادہ احتراز کرنے لگے"

میں کہاں سے کہاں چلا گیا؟ ذکر اس بات کا تھا کہ راقم الحروف آخرِ کار اُسی خانقاہ میں پہنچ گیا جس کا اپنے آپ کو سگِ درگاہ سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب اور حضرت والا کے بھانجے مولانا شبیر علی بھی وہاں بیٹھے تھے، میں اب ڈر کے مارے سوچ رہا تھا کہ بدقسمتی سے میرا مغربی لباس اور شباہت اور بعد میں تعارف حضرت والا کی ناراضگی کا موجب دو وجوہات سے ہوگا ایک تو یہ کہ میں باوجود خط و کتابت رکھنے کے بغیر اطلاع و اجازت آگیا، اور دوسرے جب وہ مجھے دیکھیں گے تو یہی خیال کریں گے

کہ اس نے دھوکہ سے بذریعہ خط و کتابت بیعت بھی قبول کروالی، اور اپنے ناپسندیدہ ماحول یعنی لباس، شکل و شباہت وغیرہ کا ذکر یا پتہ تک بھی نہ لگنے دیا۔ یعنی میری خط و کتابت سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ لکھنے والا عربی اور فارسی کا عالم تو ضرور ہی ہوگا۔ مگر جب حضرت والا میرا غیر پسندیدہ لباس دیکھیں گے تو میری دھوکہ دہی پر کتنے ناراض ہوں گے؟ میں نے یہ بھی سنا ہوا تھا کہ حضرت والا جب جلال میں آتے ہیں تو بہت ڈانٹ ڈپٹ بتلایا کرتے ہیں۔

میں اس بات کو سوچ سوچ کر پانی پانی ہوتا جا رہا تھا اور رنگ فق تھا۔ خواجہ صاحب میرا تعارف کرانے ہی لگے تھے کہ حضرت والا نے جھٹ فرما دیا "میں اس نوجوان کو جانتا ہوں، یہ امرتسر سے آیا ہے"۔ میں اس وقت سے لے کر آج تک اس بات پر حیران ہوں کہ جب حضرت والا نے ایک دو دفعہ اپنے اوپر کشف کی نفی فرمائی ہے تو ان کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ حاضرین مجلس تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ پہلے سے ملنے والا ہوگا، یا ملاقات کے متعلق تحریری اجازت لی ہوگی، مگر حاشا وکلا یہ میری پہلی حاضری تھی۔ میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ القاء تھا۔ اور حضرت والا کا ایک القاء ہی ہزاروں مکاشفات کے برابر تھا۔ لوگوں سے تو یہ سنا تھا کہ حضرت والا بہت سخت طبیعت کے بزرگ ہیں۔ مگر میں نے حضرت کو ہمیشہ سراپا رحمت ہی دیکھا۔

اسی مجلس میں حضرت والا دو باتوں کے متعلق فرمودات بیان کرتے رہے، ایک تو یہ فرمایا کہ "مجھے کسی انسان سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ اس کے فعل سے نفرت ہوتی ہے اور ناپسندیدگی اس عمل کی ہوتی ہے"۔ دوسرے آپ نے حقہ اور سگرٹ کی برائیوں کے متعلق مختصر سی گفتگو فرمائی۔ اس وقت تک تو میں حقہ اور سگرٹ کا کثرت سے عادی تھا۔ مگر یقین جانیئے کہ حضرت والا کی اس کھلی کرامت کے سبب جب میں اس مجلس سے رخصت ہوا، تو تمباکو سے اتنی نفرت پیدا ہوگئی کہ بعد میں کبھی بھی دل نہیں چاہا۔ اور آج تک تمباکو سے نفرت اسی طرح چلی آرہی ہے۔ یہ تھا حضرت اقدس کی مختصر سی توجہ اور فرمودات کا فوری اثر! سبحان اللہ! ؎

قال را بگذار مرد حال شو ؎ پیش مرد کاملے پامال شو

کشف کے متعلق تو کئی احباب نے مجھ سے ذکر کیا کہ حضرت والا نے اغلباً اپنے لئے دعا کر رکھی ہے کہ انھیں کشف نہ ہوں جیسا کہ کئی بزرگوں نے بارہ تعالےٰ سے یہی دعا کی تھی۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں حضرت والا کے القاء مکاشفات سے بھی اعلیٰ ہوتے تھے۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد راقم الحروف نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کی ملازمت چند وجوہ کی بناء پر چھوڑ دی۔ اگرچہ خانصاحب شیخ اللہ رکھا ڈپٹی انسپکٹر مدارس (جو کہ حضرت والا کے شیدائیوں میں سے تھے اور جن کا انتقال گذشتہ سال لاہور میں ہوا) نے مجھے بہتیرا منع کیا۔ مگر حالات ہی کچھ ایسے ہو چکے تھے کہ طوعاً و کرہاً حیدر آباد دکن کو خیر باد کہنا پڑا، اور احقر اپنے وطن واپس آگیا۔

امرتسر میں فروکش ہو کر راقم الحروف پنجاب میں ہی کسی قسم کی ملازمت کی کوشش کر رہا تھا اور ملازمت کے چھوڑنے کے علاوہ قلق اس بات کا بھی تھا کہ دوران سفر میں حضرت والا کی زیارت کا موقع تو مل ہی جایا کرتا تھا۔ انہی خیالات میں راقم الحروف غرق رہتا تھا کہ اچانک امرتسر میں ہی سنا کہ حضرت والا، لاہور یا امرتسر تشریف لا رہے ہیں۔ بس احقر کی خوشی کا تو کچھ نہ پوچھئے کیونکہ راقم الحروف پیشتر ہی اسی تگ و دو میں تھا کہ کب حضرت والا کی زیارت کروں۔

حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے۔ ؎

ملنے نہ ملنے کا تو مختار آپ ہے
پر تجھ کو چاہیئے کہ تگ و دو لگی رہے

یہاں حضرت حاجی صاحب کا تذکرہ آجانے سے فضا معطر ہوگئی!!! سبحان اللہ۔ حضرت اقدس مولانا تھانوی کے شیخ بھی کیسے شیخ تھے جو کہ شیخ العرب والعجم تھے۔

حضرت حاجی صاحب بھی اسی سلسلے کی مجاہد ہستیوں میں سے ایک مجاہد تھے جس سلسلہ میں حضرت سید احمد بریلوی، حضرت مولانا اسمٰعیل شہید اور حاجی صاحب کے مرید حضرت شیخ الہند مولانا

تنقید و تبصرہ

تذکرۂ حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ!

مصنفہ خلیق احمد صاحب نظامی، سائز ۲۰×۲۶/۸
ضخامت ۳۹۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر
جلد اور ڈسٹ کور پائیدار۔ قیمت سات روپے ہے،
"ندوۃ المصنفین دہلی" سے طلب کیجئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ۔ دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے ایک یکتائے روزگار عالم، ایک فقیہ النفس، حق آگاہ، معارف پناہ اور روشن ضمیر بزرگ تھے جنھیں اپنے زمانے میں ہندوستان کے شمالی علاقے میں صرف ترویج حدیث ہی کی سعادت میسّر نہیں آئی بلکہ اللہ نے ان کے قلم و زبان اور دل و ضمیر کو سیّد محمد جونپوری کے دعوئے مہدیت سے پیدا شدہ اعتقادی گمراہی، اکبر کے دینِ الٰہی، اس کے نظریۂ الفی، اور اس کے من گھڑت اعتقادات یعنی ایمان کی تکمیل کو صرف وحدانیت تک محدود کر دینے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، شریعت کے جملہ قوانین اور ایمان کی ساری ضرورتوں کو اس دائرہ سے باہر نکال پھینکنے کی سعی، ارکانِ دین اور عقائد اسلامی میں سے اکثر کے ساتھ، چاہے وہ اُصول سے تعلق رکھتے ہوں یا فروع سے، بے تکلّف تمسخر اور استہزا کرنے، قرآن کے تواتر اور قرآن کے کلام خداوندی ہونے کے انکار، بدن کے فنا کے بعد رُوح کے باقی رہنے، ثواب و عذاب کو محال سمجھنے، عربی جاننے، پڑھنے کو بُرا خیال کرنے، آفتاب کی عبادت کرنے، سُور اور کُتّے کے ناپاک ہونے کے مسئلہ کو منسوخ کر دینے کے جو ہولناک فتنے اُس زمانہ میں دربارِ اکبری میں، خود اکبر کی جہالت اور خود غرض، جاہ پرست اور دین فروش علماء کی کج بحثیوں، خود غرضانہ موشگافیوں اور قابل نفرت طمع پرستیوں سے پرورش پا رہے تھے، ان سب کا مقابلہ کرنے، ان کا راستہ روک دینے، اور شریعت و سنّت کو ان کے تمام جمال و رعنائی اور حسن و زیبائی کے ساتھ زندہ کر دینے کی توفیق حاصل ہوئی

شیخ نے ۹۵۸ھ میں دہلی کے ایک سربرآوردہ، نیک سیرت، علمی اور صالح خاندان میں ولادت پائی، ان کی ساری تعلیم ان کے والد ماجد مولٰنا سیف الدین کے شوقِ علم اور حکیمانہ تربیت کی مرہون منّت تھی، ۳۰ سال کی عُمر میں وہ حجاز گئے اور وہاں مشہور محدث شیخ علی متقی کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی سے مشکوٰۃ شریف پڑھی اور تصوّف و سلوک باطنی کی تعلیم پائی۔ پھر شیخ عبدالوہاب ہی کے اصرار پر ۱۰۰۰ھ میں ہندوستان واپس لوٹے، واپسی پر دہلی میں مسند درس و ارشاد بچھائی، اور اپنے تازہ قلم، نفس گرم، عزمِ محکم سے بدعات و سیئات، اور علماء سوء اور ملاحدہ اکبری اور ملاعنۂ شاہی کے زیغ و ضلال اور زندقہ و الحاد کی سرکوبی میں مشغول ہو گئے۔ گویا محدث دہلوی کی ولادت سلیم شاہ سوری کے عہد میں ہوئی اور جہانگیر کے سنہ جلوس میں آپنے وفات پائی۔ اس طرح آپ کو اسلام شاہ، ابراہیم شاہ، ہمایوں، جہانگیر مہریز خاں، احمد خاں، سکندر شاہ، اکبر، شاہجہاں کا عہد حکومت دیکھنے کا موقعہ ملا، شیخ کے روحانی مرشدوں میں ان کے والد ماجد مولٰنا سیف الدین، حضرت سیّد موسیٰ گیلانی، ان کے استاذ شیخ عبدالوہاب متقی اور خواجہ باقی باللہ کے اسماء گرامی شامل ہیں۔ معاصرین میں حضرت مجدّد الف ثانی، حضرت ابو المعالی، شیخ عبداللہ نیازی سے بزرگانِ دین نواب مرتضیٰ خاں، شیخ فرید، عبدالرحیم خانخاناں، اور ملک الشعراء فیضی سے با اختیار امراء، ملا عبدالقادر بدایونی، مرزا نظام الدین احمد بخشی، میر سیّد طبیب بلگرامی، محمد غوث شطاری سے باکمال حضرات شامل تھے، آپ کی تصانیف کی تعداد ۶۰ سے متجاوز ہے جس میں مشکوٰۃ کی فارسی شرح "اشعۃ اللمعات" عربی زبان میں مشکوۃ کی شرح "لمعات التنقیح" مولٰنا مجد الدین فیروز آبادی صاحب "قاموس" کی

کتاب "سفر السعادت" کی شرح، سیرت کی عظیم الشان کتاب "مدارج النبوۃ" اور سیر و تذکرہ کی مشہور تصنیف "اخبار الاخیار" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

چورانوے ۹۴ سال کی عمر (۱۰۵۲ھ) میں انوارِ الٰہی کے اس خوشہ چیں، اور معرفت و ہدایت کے اس گلچیں نے وفات پائی۔

محدث دہلوی ان جاں سپار حق شناسوں، وسیع النظر دور بیں اور صاحب عزیمت علماء، بیدار مغز، روشن دل حکیموں کے سرگروہ، اور سید الطائفہ تھے، جن کی علمی اور عملی سرگرمیوں کو قدرت کے حسن قبول اور حسن نظر نے بقاء دوام بخشی۔ ان کی ایمانی جرأت کی شہرت، زمان و مکان کے تمام فاصلوں کو طے کر کے اپنے ماحول سے آگے بڑھی اور صدیوں تک ان کے مکارم اخلاق، محامد افعال کو پوری اُمت کے لئے دلیلِ راہ بننے کا فخر حاصل ہوا۔

زیرِ نظر کتاب میں نوجوان مصنف و محقق خلیق احمد نظامی نے محدث دہلویؒ کے حالات پیش کئے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ تحقیق و جستجو علمی محنت اور تاریخی ذمہ داریوں کا حق ادا کر دیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مصنف نے اپنی محنت سے صدیوں کے بعد شیخ کے علوم و معارف کو زندہ، اُن کی زندگی کے ہر ہر گوشے، اُن کی زبان سے نکلی ہوئی ہر ہر صدا، اور اُن کے قلم کے ہر ہر حرف کو حیاتِ نو بخشی ہے تو یہ امر واقعہ کے ذرا بھی خلاف نہ ہوگا۔ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ ان پانچ حصوں کے ساتھ ایک مقدمہ اور اخیر میں تعلیقات شامل ہیں، کتاب کے پہلے حصہ میں محدث کے ذاتی حالات اور ان کی زندگی کے تمام مناظر پیش کئے گئے ہیں، دوسرے میں ان کی تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے، تیسرے میں محدث کے معاصرین کا ذکر ہے، چوتھے میں محدث کی اولاد و امجاد کا سراپا دکھایا گیا ہے، پانچویں میں محدث کی علمی اور دینی خدمات پر گفتگو کی گئی ہے۔ تعلیقات کے حصہ میں محدث کا ایک خط حضرت مجدد الف ثانی کے نام، فیضی کے کئی خطوط خود محدث کے نام، اکبر کے انتقال پر محدث کا ایک موعظت آمیز خط نواب سید فرید مرتضیٰ خاں کے نام شامل ہیں۔ مگر یہ سب چیزیں فارسی میں ہیں، جس کی وجہ سے اُردو داں طبقہ کے لئے ان سب چیزوں کا لطف و فائدہ ختم ہو گیا ہے۔ نظامی صاحب اصل مضامین کے ساتھ اُن کا اُردو ترجمہ بھی شائع کرتے تو بہت اچھا ہوتا۔ پوری کتاب میں جہاں جہاں عربی اور فارسی عبارتیں آئی ہیں وہاں ترجمہ دیا گیا ہے مگر اُس ترجمہ میں بھی اصلاح کی گنجائش ہے۔ مصنف نے پُرزور الفاظ میں اس کی تردید کی ہے کہ شیخ اور شاہ ولی اللہؒ سے پہلے ہندوستان میں علم حدیث نہیں تھا، یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کے شمالی علاقہ میں جہاں اس وقت کے سیاسی حالات نے علم حدیث کی شمع کو گل کر دیا تھا، قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں محدث ہی کی زبان پر آئیں، مگر اس روایت میں کوئی حقیقت نہیں کہ حدیث کو سب سے پہلے ہندوستان میں لانے والے یہی دو حضرات ہیں، آپ نے محدث سے پہلے کے دو ہندوستانی محدثین حاجی ابراہیم قادری المتوفی (سنہ ۱۰۰۱ھ) جو مصری علماء شیخ شمس الدین علقمی، شیخ مسعود مغربی، اور شیخ علی متقی کے شاگرد تھے، نیز مولانا اسمٰعیل لاہوری (المتوفی سنہ ۹۸۰ھ) کا جو ایرانی علماء شیخ الاسلام مولانا سیف الدین احمد شہید ہروی، اور امیر جمال الدین عطاء اللہ محدث کے شاگرد تھے۔ تعارف کرایا ہے۔ نظامی صاحب کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں بنگال کے بادشاہ علاؤ الدین حسینی شاہ (المتوفی سنہ ۱۵۲۰ء) کو محمد بن یزداں خواجگی شروانی نے صحیح بخاری کا نسخہ پیش کیا تھا جو تین جلدوں پر مشتمل تھا، اور اب بانکی پور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ گجرات میں میر سید عبد الاول (سنہ ۹۶۸ھ) نے صحیح بخاری کی شرح "فیض الباری" کے نام سے لکھی تھی، شیخ عبد المالک عباسی نے صحیح بخاری کا اس قدر مطالعہ کیا تھا کہ پوری کتاب ان کو حفظ یاد ہو گئی تھی، شیخ محمد بن طاہر پٹنی گجراتی نے صحاح ستہ کی شرح "مجمع البحار" کے نام سے لکھی۔ اور مشکوٰۃ کی لغات پر رسالہ "فی حل لغات المشکوٰۃ"، تصنیف فرمایا۔

برہان پور میں شیخ طیب نے مشکوٰۃ پر حاشیہ لکھا، حکیم عثمان صدیقی شاگرد شیخ وجیہ الدین نے صحیح بخاری کی شرح لکھی۔

عام لوگوں اور خصوصاً درسی اور علمی حلقوں میں فن حدیث کے متعلق یہ بڑی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ ان شواہد کی روشنی میں ضروری ہے کہ اس خیال کی تصحیح کی جائے ‡

(سید محمد ازہر شاہ قیصر)

لغات القرآن جلد چہارم!

مصنف عبدالرشید نعمانی، ضخامت ۳۸۲ صفحات

سائز $\frac{20 \times 30}{26}$ کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ

قیمت مجلد چھ روپے ۶؍، غیر مجلد پانچ روپے

ملنے کا پتہ:۔ ندوۃ المصنفین اُردو بازار دہلی

معارف قرآنی کی تفہیم کو آسان کرنے اور حقائق ربانی میں فکر و تدبر کی راہوں کو کشادہ کرنے کے لئے عربی اور اُردو میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں "الفاظ قرآن" کے ساتھ لغات قرآنی کی تشریح بھی کی گئی ہے مگر ندوۃ المصنفین دہلی نے جن کے ذمہ دار حضرات امت کی علمی ضرورتوں کے نبض شناس اور زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اسلامی علوم کو مناسب اور موزون لباس میں پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، یہ ضرورت محسوس کی کہ لغات قرآنی کے موضوع پر ایک جامع، مکمل اور مستند کتاب تحقیق کی روشنی میں مرتب کیجائے جو قرآن کریم کے مطالب و مفاہیم کو سمجھنے میں ہر حیثیت سے مدد دے سکے۔ جس میں الفاظ قرآنی کی مکمل تشریح بھی ہو اور متعلقہ مباحث کی ضروری تفصیل بھی، اس اعلیٰ معیار پر اس نے اپنے ایک رفیق ادارہ سے "لغات القرآن" کے نام سے ایک کتاب کی ترتیب کا کام لیا "لغات القرآن" کی تین جلدیں پہلے شائع ہو چکی ہیں، اس چوتھی جلد میں "ص" سے "عین" تک کے الفاظ و لغات کی تحقیق کی گئی ہے، مصنف کو مراد قرآنی کو متعین کرنے کے لئے تفسیر و حدیث کے علاوہ ادب، صرف، نحو اور تاریخ کی بے شمار کتابوں کا مُطالعہ کرنا پڑا ہے، اِس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف قرآن کریم کے لغت و الفاظ کا حل ہی نہیں پیش کرتی بلکہ ان الفاظ و لغات سے متعلقہ مباحث و مسائل پر محققانہ روشنی بھی ڈالتی ہے، اِس جلد کے بالکل شروع میں فرقہ صابئیہ کے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں اور آگے چل کر طوبیٰ، طور، عابدون اور عابری پر جو تاریخی، حدیثی اور تفسیری بحثیں کی گئی ہیں وہ سب اس کی واضح مثالیں ہیں۔ "صابئین" کی بحث میں اگر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب محدث کشمیریؒ کے اُن افادات سے بھی جو "فیض الباری" میں مذکور ہیں مدد لیجاتی تو بحث بہمہ وجوہ مکمل ہو جاتی۔

(سید محمد ازہر شاہ قیصر)

سیرت و صورت!

مصنفہ سید ودود الحی صاحب ندوی بزبان انگریزی، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۴۷۔ ملنے کا پتہ:

مجلس سیرت ٹن ٹن پورہ اسٹریٹ بمبئی ۶؍

یہ کتاب میں نے شروع سے آخر تک دیکھی، سیرت پر یہ مختصر کتاب اِس ترتیب سے لکھی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کے ہر گوشے پر روشنی پڑجاتی ہے، آپ کا طرزِ گفتگو، صداقت پسندی، نظافت طبع، حیا، سادگی، سخاوت، اپنی اور دوسروں کی خدمتگذاری، ضیافت، خودنمائی سے اجتناب، طبیعت کا غنا، غرض ہر پہلو پر اس کتاب میں روشنی موجود ہے، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا خلاصہ اور آخر میں حجۃ الوداع کا خطبہ درج ہے۔ اِن سب چیزوں کو ایسی ترتیب سے جمع کر دیا گیا ہے کہ مُطالعہ کرنے والے کے سامنے ایک سچے رہبر کی زندگی کا اگر مکمل نہیں تو ایک دُھندلا سا خاکہ ضرور آجاتا ہے جس سے مزید معلومات کی خواہش دِل میں پیدا ہوتی ہے۔

بہر حال ان مطبوعات کا سلسلہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ البتہ ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے جسے آئندہ ایڈیشن میں اُمید ہے کہ پورا کر دیا جائے گا۔ حوالہ جات ہونے ضروری ہیں، صرف یہ کہہ دینا کہ مستند کتابوں سے اخذ کر کے یہ کتاب لکھی گئی ہے کافی نہیں ہے جب تک کہ ہر کتاب کا حوالہ نہ ہو۔ (مولانا) عزیز احمد فیض آبادی)

نورِ توحید!

از جناب ابو محمد امام الدین رام نگری، سائز مختصر، ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ و طباعت متوسط قیمت ۶؍

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ تحفظ اردو، رام نگر بنارس اسٹیٹ

نور توحید کے تحقیقی جائزے میں اس کے مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ مولانا مودودی پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں اُن کا جواب دیں، اولاً تو ہندوستان کی جماعت اسلامی کا تعلق پاکستان کی جماعت اسلامی سے ہے ہی نہیں جیسا کہ امیر جماعت اسلامی ہند کا اعلان ہے، پھر مودودی صاحب کے ذاتی عقائد و افکار کے تمام اراکین جماعت اسلامی پابند بھی نہیں ہیں جیسا کہ مختلف تحریروں میں ذمہ داران جماعت اسلامی نے تصریح فرمائی ہے پھر مولٰنا امام الدین صاحب رام نگری کو کیا ضرورت تھی کہ امیر جماعت اسلامی پاکستان پر کچھ اعتراضات، جا ہوں، یا بیجا، دیکھکر تڑپ اُٹھیں، موصوف کے اِس اقدام پر شبہ ہونے لگتا ہے کہ ذمہ داران جماعت اسلامی کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ہندوستان کی جماعت اسلامی کا کوئی تعلق پاکستان کی جماعت اسلامی سے نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہنا واقعہ کے خلاف ہے کہ اراکین جماعت اسلامی مودودی صاحب کے ذاتی عقائد سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔

زیر نظر کتابچہ میں "نور توحید" کے ایک مضمون کا "تحقیقی جائزہ" لیا گیا ہے۔ جس میں مولٰنا مودودی صاحب کے عقائد پر کچھ اعتراضات ہیں۔ اُن اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش بجائے مودودی صاحب نے تو کی نہیں۔ لیکن امام الدین صاحب رام نگری نے اُن کے جواب میں اولاً تو خود مودودی صاحب کے اقوال پیش کئے ہیں، مثلاً دجال والی حدیث کے بارے میں مودودی صاحب کی کچھ اپنی نجی تحقیق ہے۔ مگر امام الدین صاحب فرماتے ہیں کہ مودودی صاحب کا عقیدہ ہے کہ ظہور دجال حق ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کے اس عقیدہ کی بُنیاد کیا ہے۔ آیا اس کی بُنیاد کوئی حدیث ہے یا ذاتی اندازہ یا قیاس ہے"۔ جب مودودی صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے "ذاتی اندازے اور قیاس" کو صحیح نہیں سمجھتے تو خود ان کے ذاتی اندازہ و قیاس کی دُنیا میں کیا قیمت رہجاتی ہے؟

دوسرے اُن اعتراضات کے جواب میں متعدد علمائے اہلحدیث کے اقوال اور فتاوی پیش کئے گئے ہیں، لیکن انھیں فتاوے میں ایک فتوی مولٰنا عبیداللہ صاحب مبارکپوری کا بھی ہے جس میں مولانا نے

موصوف نے مودودی صاحب کے عقائد کی فہرست پیش کرکے اُن سے اختلاف کیا ہے جبکہ مولٰنا مودودی صاحب کو نعوذ باللہ نہ کوئی کافر کہتا ہے، نہ مشرک اور نہ بے دین، بلکہ اعتراض یہ ہوتا کہ ان کے عقائد اہلسنت والجماعت کے خلاف ہیں اور معتزلہ و خوارج کے اعتقادات سے ان کی سرحد ملجاتی ہے۔ تو پھر کوشش دو طرح کی ہوسکتی ہے یا تو مودودی صاحب سے گذارش کرکے ان کے عقائد بدلوائے جائیں یا پھر عقائد اہلسنت و الجماعت کی ایسی تشریح کرنے کی کوشش کیجائے کہ مودودی صاحب کے عقائد خلاف عقائد اہل سنت والجماعت نہ معلوم ہوں۔ پہلی کوشش کی تو اراکین جماعت اسلامی میں سے کسی میں ہمت نہیں بلکہ اگر کوئی دوسرا کوشش کرتا ہے تو اس کا استقبال صم صم دریدہ دہنی سے کیا جاتا ہے البتہ تمام اراکین جماعت اسلامی خواہ وہ ہند کے ہوں یا پاکستان کے دوسری طرح کی کوشش میں دل و جان سے مصروف ہیں، دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اسی قسم کی ایک کوشش یہ بھی ہے جو "نور توحید کا تحقیقی جائزہ" کی عہ صورت میں ظاہر ہوئی ہے + (مولانا عزیز احمد فیض آبادی)

نقش حیات

خود نوشت داستانِ زندگی

از حضرت مولٰنا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی

جلد اوّل

جس میں حضرت موصوف کے خاندان، ابتدائی زندگی، تعلیم حضرت شیخ الہند مولٰنا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضری، دارالعلوم دیوبند میں داخلہ اور اُن حالات پر شرح و بسط اور پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہو جن سے متاثر ہوکر مسلمانان ہند بالخصوص شیخ الہند اور اکابر علماء ہند نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ اور بہترین، ٹائٹل آرٹ پیپر پر بلاک سے چھپا ہوا ہے، کتاب کی ترتیب دیدہ زیب ہے۔ قیمت فی جلد پانچ روپے صہ +

دوسری جلد بھی عنقریب شائع ہوجائے گی۔ پاکستان کے خریدار ہر دو جلد کی قیمت اس پتہ پر روانہ کرکے رسید ہمیں بھیجدیں، پتہ یہ ہے:-

"حافظ محمد سعید ابن مولٰنا خدا بخش صاحب خطیب جامع مسجد، بیرون دہلی دروازہ ملتان"

المشتھر

صاحبزادہ مولوی اسعد صاحب مدنی منزل

دیوبند (یو۔پی)

ادبیات :-

پروازِ تخیّل

(از آلم مظفّر نگری)

دِکھا دے تو بھی اعجازِ کمالِ مے کشی ساقی
اُبھر آیا مہ تاباں وہ چھٹکی چاندنی ساقی

کوئی واقف نہیں کیا ہے مآلِ زندگی ساقی
گرفتارِ طلسمِ آرزو ہے آدمی ساقی

حدِ دشت و چمن تک ہی نہ تو محدود رکھ اس کو
بڑھا وسعت کو دُنیائے جنوں کی اور بھی ساقی

وہ دیوانے فریبِ رنگ و بُو سے بچ نہیں سکتے
بہاروں میں جنھیں پھُولوں سے ہے دلبستگی ساقی

جو ہنگامے جہاں میں باعثِ تنظیمِ عشرت ہیں
وہی ہونے کو ہیں اک روز وجہ برہمی ساقی

اگر بڑھتا رہا ذوقِ خودی اہلِ محبّت میں
کِسی دن ٹُوٹ جائے گا طلسمِ بیخودی ساقی

لئے بیٹھا ہے ظرفِ تنگ میں اپنے کئی عالم
وہ ذرّہ جس میں باقی ہے مجالِ زندگی ساقی

کیا کرتی ہے اس کا خیر مقدم بڑھ کے ناکامی
مُسافر جب سمجھتا ہے کہ منزل آگئی ساقی

ہر اک موجِ نفس دیتی ہے پیغامِ یقیں اس کو
ستم پھر بھی مغلوبِ گماں ہے آدمی ساقی

ہے جس عالم میں بھی خود حاصلِ تقدیر سجدہ ہے
سرِ تسلیم کو کیا احتیاجِ بندگی ساقی

تجلّی چھن رہی ہے پردۂ ظلمت کے دامن سے
نویدِ صبحِ عشرت دے گی شامِ زندگی ساقی

سمجھتا ہے جو معنیٔ وفا اس مردِ مومن کو
اُخوّت کی جہانگیری سے ہے دل بستگی ساقی

بہ تقدیرِ ازل ہوں جذبۂ تخلیق کا ضامن
ہے رازِ کن فکاں کی شرح میری زندگی ساقی

ہویدا پھر ہیں آثارِ قیامت بزمِ ہستی میں
مرے نالوں کو کس نے رخصتِ پرواز دی ساقی

بنا دے بے نیازِ رہبر و بانگِ جرس مجھ کو
مرے پائے طلب کو دے شعورِ خود روی ساقی

خُدا کے واسطے اُس جلوہ گاہِ دل میں پہنچا دے
سلامی ہیں جہاں عزّ و وقارِ زندگی ساقی

کتبہٗ :- (سیّد علی احمد کاتب) (تلمیذ منشی محبوب علی میرٹھی)

.J. A. 804